# معارف

اپریل ۲۰۱۹ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

# سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

**HAFIZ SAJJAD ELAHI**

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

**DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH**

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

**Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org**

**Website: www.shibliacademy.org**

**Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh**

**Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100**

**✆ (Office Mobile) 09170060782**

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

# معارف

جلد نمبر ۲۰۳ | ماہ شعبان المعظم ۱۴۴۰ھ مطابق ماہ اپریل ۲۰۱۹ء | عدد ۴

## فہرست مضامین





دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

# شذرات

نیوزی لینڈ دنیا کے آخری سرے پر شمالی مغربی اوقیانوس میں جزائر کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے۔ بڑے جزائر تو صرف دو ہیں، شمالی اور مغربی جزیرے لیکن چھوٹے جزائر بہت ہیں۔ اس کا قریب ترین پڑوسی آسٹریلیا بھی اس سے دو ہزار کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ کرہ ارض پر سب سے بعد میں آباد ہونے والا خطہ یہی ہے۔ اس کا سبب دوسرے آباد خطوں سے اس کی غیر معمولی دوری رہی ہے۔ سب سے پہلے یہاں انسانوں کے قدم تیرہویں صدی عیسوی میں پہنچے جب مشرقی پولینیشین یہاں آباد ہوئے۔ ان کی اولاد اب بھی یہاں موجود ہے اور یہ لوگ ماوری (Maori) کے نام سے جانے جاتے ہیں اور انگریزی کے ساتھ ساتھ ماوری زبان بھی یہاں بولی جاتی ہے۔ ولندیزی مہم جو آبیل تسمان پہلا یوروپین تھا جس نے ۱۶۴۲ میں اس خطہ ارض کو دریافت کیا اور اس طرح یہاں یوروپین آباد کاروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مشہور انگریز سیاح کیپٹن کک ۱۷۶۹ میں یہاں پہنچا۔ ۱۸۴۶ میں یہ خطہ برٹش تسلط کے زیر اثر آ گیا۔ ۱۹۴۷ میں اسے آزادی ملی اور اب وہ ایک پارلیمانی جمہوریت اور کامن ویلتھ کا رکن ہے۔ یہاں کی کل آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہے اور اس کی غالب اکثریت یوروپین اصل کے سفید فام لوگوں پر مشتمل ہے جو عیسائی عقیدہ کے حامل ہیں۔ مسلمان کل آبادی کا بہ مشکل ایک فی صد ہیں۔ دارالسلطنت ولنگٹن ہے۔ سب سے بڑا شہر آک لینڈ ہے۔ دوسرے اہم شہروں میں کرائسٹ چرچ اور ہملٹن وغیرہ شامل ہیں۔ معیار زندگی، تعلیم، صحت، معاشی آزادی اور حقوق انسانی کے احترام جیسے کلیدی شعبوں میں اس کی کارکردگی کا معیار بہت بلند ہے۔ فن لینڈ کے بعد یہ دنیا کا سب سے زیادہ پُرامن ملک مانا جاتا ہے۔ چند سال پہلے جب جارج واشنگٹن یونیورسٹی، امریکہ کے پروفیسر سید حسن عسکری نے ۲۰۸ ممالک کا یہ معلوم کرنے کے لیے سروے کیا تھا کہ ان ممالک میں روزمرہ کی زندگی میں بنیادی اسلامی اقدار پر کس حد تک عمل کیا جاتا ہے تو اس سروے میں نیوزی لینڈ پہلے نمبر پر رہا تھا۔ بدقسمتی سے مسلمان ممالک اس دوڑ میں بہت پیچھے تھے۔ ایک ایسے پُرامن ملک میں جہاں جرائم کی شرح صفر ہے جب ۱۵؍ مارچ کو کرائسٹ چرچ کی دو مساجد، مسجد النور اور لِن وڈ مسجد ایک سفید عیسائی نسل پرست کے دہشت گردانہ حملہ کا نشانہ بنیں جس میں ۵۰ مسلمان

شہید اور قریب اتنے ہی شدید زخمی ہوئے تو فطری طور پر حیرت اور صدمہ دونوں زیادہ ہوا۔

مشرق وسطیٰ اور دوسرے مسلم ممالک سے مغربی ممالک کی طرف مہاجرت کا سلسلہ بہت دنوں سے جاری رہا ہے۔ پہلے لوگ ایک بہتر زندگی کی تلاش میں مغربی دنیا کا رخ کرتے تھے۔ گذشتہ کچھ برسوں میں عراق، لیبیا، شام اور افغانستان جیسے علاقوں سے بڑی تعداد میں لوگ اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے پناہ گزین کی حیثیت سے ان علاقوں کی طرف جاتے رہے ہیں۔ یہ پناہ گزین جن سنگین مسائل سے دوچار ہوتے ہیں ان کے ذکر کا یہاں موقع نہیں۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح ان میں سے بہت سے مظلوموں کو مغربی ممالک میں پناہ مل جاتی ہے۔ لیکن مغربی معاشرہ کے وسیع حلقوں میں اس صورت حال کے خلاف بہت سخت ردعمل بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں سفید فام قوم پرستی اور سفید فام قوموں کے نسلی تفوق اور برتری کے نظریہ کی مقبولیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی مہم میں غیر معمولی حد تک تیزی آگئی اور ان کو حملہ آور کے طور پر پیش کیا جانے لگا جن کا وجود مغربی اقدار کے لیے سنگین خطرہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس موہوم خطرہ کی روک تھام کے لیے مسلم دشمنی پر مبنی بہت سی تحریکات وجود میں آگئیں۔ نائن الیون کے حادثہ اور القاعدہ جیسی تنظیموں کے ظہور نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور پوری مغربی دنیا اسلام دشمنی کی ایک تیز اور تند لہر کی زد میں آگئی۔ اسی ضمن میں ایوروبیا (Eurobia) کا تصور سامنے آیا جو اس نام نہاد خطرہ کی نشان دہی کرتا ہے کہ اس طرح جو عمل شروع ہوا ہے وہ یوروپ کے اسلامائی زیشن اور اربی سائی زیشن پر منتج ہوگا اور اس طرح یہ خطہ یوروپ کے بجائے ایوروبیا کی شکل اختیار کرلے گا جہاں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ فرانس کے انتہا پسند مصنف رینالڈ کیمس (Renaud Camus) نے اپنی کتاب Le grand Replacement میں تبادل آبادی کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق اگر اس رجحان کو روکا نہ گیا تو پناہ گزین یوروپ پر قابض ہوجائیں گے اور یہاں کے اصل باشندے اقلیت میں تبدیل ہوجائیں گے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ امریکہ اور یوروپ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت ایک مرض کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ چنانچہ یوروپ اور امریکہ میں سفید فام نسلوں کی برتری پر یقین رکھنے والی بے شمار تحریکیں سرگرم عمل ہیں۔ وہ اگرچہ ہر نسل اور ہر قوم کے پناہ گزینوں کے خلاف ہیں لیکن ان کا اصل نشانہ اسلام اور مسلمان ہیں۔ ہٹنگٹن کے تہذیبوں کے ٹکراؤ کے نظریہ نے بھی مغربی معاشروں میں اسلام دشمنی کے جذبات کو فروغ

دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔مغربی ممالک میں اسلام دشمنی (اسلاموفوبیا) نے ایک وبائی مرض کی صورت اختیار کرلی ہے اور وہاں کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد اس میں مبتلا ہے۔لاعلمی، غلط فہمی، افواہ، جھوٹا پروپگنڈہ اور ماضی خصوصاً صلیبی عہد سے وراثت میں ملنے والے تعصّبات کے مرکب سے وہ زہریلا مادہ پیدا ہوا ہے جو اس مرض کا باعث ہے جو اسلاموفوبیا کے نام سے جانا جاتا ہے۔آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری فوبیا کی تعریف اس طرح کرتی ہے:''ذہن کی مریضانہ کیفیت جو کسی طرف سے خوف یا نفرت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے''۔یہ بیماری مختلف شکلوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔کسی کو بلندی سے خوف آتا ہے تو کسی کو پانی سے یا کسی اور چیز سے۔آج مغربی دنیا کو اسلام کا خوف دامن گیر ہے اور اس خوف کے بطن سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

---

ٹارنٹ برنٹن انہی منفی عوامل کی پیداوار اور اسی بیماری کا شکار ہے۔اس مریضانہ ذہنیت کے نتیجہ میں وجود میں آنے والے اپنے ہفوات کو اس نے ۷۳ صفحات پر پھیلے ہوئے ایک مینی فیسٹو میں ریکارڈ کیا تھا اور حملہ سے نومنٹ پہلے وزیر اعظم سمیت بہت سی اہم شخصیات کو میل کیا تھا گو اس میں اس بات کا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ یہ حملہ کب اور کہاں ہوگا۔کیمس کے نظریات سے اس کی تاثر پذیری اس بات سے ظاہر ہے کہ اس نے اپنے نام نہاد مینی فیسٹو کا نام بھی بعینہٖ وہی رکھا ہے جو کیمس کی کتاب کا ہے یعنی The Great Replacement۔اس نے ٹویٹر اور سوشل میڈیا کے ذریعہ اسے شیئر بھی کیا۔اس کے علاوہ حملہ کے وقت اس نے اپنی پیشانی پر ایک کیمرہ لگا رکھا تھا جس کے وسیلہ سے اس المناک حملہ کی تفصیلات کو وہ براہ راست نشر بھی کرتا رہا۔اس مینی فیسٹو سے جو معلومات دستیاب ہوسکی ہیں ان سے واضح ہے کہ یہ اسلاموفوبیا کا ایک کلاسک کیس ہے۔اس کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اس وقت غیر یوروپی اقوام خاص طور سے مسلمان یوروپ پر حملہ آور ہیں۔اگر یہ سلسلہ موثر طور پر روکا نہ گیا تو کچھ ہی دنوں میں ان کو اکثریت حاصل ہوجائے گی اور یوروپ پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہوجائے گا۔اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان کو وہیں واپس بھیج دیا جائے جہاں سے وہ آئے ہیں۔وہ اپنے آپ کو نازی نہیں کہتا لیکن نونازی علامتوں کو اس نے استعمال کیا ہے۔وہ اپنے آپ کو نسلی برتری پر مبنی قوم پرستی کے علم بردار کے طور پر پیش کرتا ہے (ethno-nationalist)۔وہ اپنے آپ کو Kebab removalist بھی کہتا ہے۔کباب ریمووہ تحریک تھی جو بوسنیا میں مسلمانوں کی نسلی تطہیر کے لیے کوشاں تھی۔اس کا مقصد بوسنیا سے

مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دینا تھا۔ Remove Kebab کی تحریک خاص طور سے ان سربیائی فوجوں میں بہت مقبول تھی جو بوسنیا سے مسلمانوں کے وجود کو مٹانے کے لیے روڈوان کارڈزک کی قیادت میں برسر پیکار تھے۔ ان کے نغمہ کے دو مصرعے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں، اس سے اس تحریک کی نوعیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

Kardzik lead your Serbs  God is Serb and He will Protect us

یہ وہی کارڈزک ہے جس کو مارچ ۲۰۱۶ میں عالمی عدالت انصاف نے بوسنیائی مسلمانوں کی نسل کشی کے الزام میں عمر قید کی سزا سنائی۔ اہم بات یہ ہے کہ کئی سال پر محیط اس مقدمہ کی سماعت اور فیصلہ سنانے کے دوران کسی بھی وقت اس کے چہرے بشرے سے اپنے کرتوتوں پر کسی ندامت یا شرمساری کا اظہار نہیں ہوا بلکہ اپنے ''کارناموں'' پر اسے فخر ہی رہا۔

---

ٹارنٹ نے اپنی بندوق کے دستہ پر بہت سے سنین اور تاریخی واقعات کے متعلق اشارے بھی لکھ رکھے تھے۔ ان سب کا تعلق ماضی میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کشمکش اور جنگوں سے ہے۔ اس نے یوروپ میں دولت عثمانیہ کے نفوذ اور تسلط سے وابستہ واقعات کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس کے خیال میں گذشتہ تیرہ سو سال میں اسلام کے ہاتھوں عیسائیت کو جو زک پہنچی ہے اس کا انتقام لیا جانا چاہیے۔ وہ عیسائی عظمت کی علامت قسطنطنیہ (استانبول) کی بازیافت کی بات کرتا ہے۔ وہ ان لوگوں کا ذکر کرتا ہے جن سے وہ متاثر ہوا ہے۔ اس فہرست میں ایک نمایاں نام اسلام دشمن AndreBehring Breivik کا ہے جس سے تاثر پذیری کا اس نے خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ دور حاضر میں جن لیڈروں سے وہ متاثر ہوا ہے، ان میں ڈونلڈ ٹرمپ کا نام سرفہرست ہے۔

---

نیوزی لینڈ میں مسلمان آبادی کا تناسب ایک فیصد سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ یہاں مستقبل بعید میں بھی تبادل آبادی کا کوئی خطرہ تھا نہ اندیشہ۔ اس کے علاوہ نیوزی لینڈ ایک ایسا ملک ہے جس کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ پُرامن ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ یہ سفید فام عیسائی اکثریت کا ملک ہے چنانچہ یہاں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو مسلمانوں کے سلسلہ میں منفی جذبات رکھتے ہیں اور دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف جاری پروپگنڈہ سے متاثر ہیں۔ سحر غم خور ایک افغان جرنلسٹ ہیں اور اپنے خاندان کے ساتھ نیوزی لینڈ میں رہ چکی ہیں۔ انہوں نے اس

سلسلہ میں اپنے تجربات کا ذکر الجزیرہ میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کیا ہے۔ ٹارنٹ کو یہ امید رہی ہوگی کہ اس کی یہ مذموم حرکت ان عناصر کی تقویت کی باعث بنے گی۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اس حادثہ کے بعد وزیر اعظم اور ان کی قیادت میں ملک کی اکثریت نے جو طرز عمل اختیار کیا اس کے پیش نظر ان عناصر کے لیے کچھ کہنے یا کرنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ وزیر اعظم جسنڈا آرڈرن نے اس پورے بیانیہ ہی کو بدل دیا جو اس وقت اسلام کے خلاف دنیا میں رائج ہے۔ وہ ہم میں سے ہیں اور ہمارا حصہ ہیں کہہ کر اور عملی طور پر اس کا ثبوت فراہم کر کے انہوں نے ''ہم'' اور ''وہ'' کے امتیاز کو یکسر مٹا دیا اور اس تقسیم کی بنیاد ہی کو مسمار کر دیا۔ ان کی قیادت میں نیوزی لینڈ کی حکومت اور سول سوسائٹی نے اس المیہ کے بعد جس ردعمل کا اظہار کیا وہ اب تک کہیں اور نظر نہیں آیا۔ یہ ردعمل بغیر کسی حیص بیص کے بروقت اور فوری تھا۔ اب تک اس طرح کی صورت حال میں حکومتیں ایک لاتعلقانہ طرز عمل اختیار کرتی رہی ہیں اور ہمیشہ معاملات کو کسی طرح ٹالنے کی کوشش ہی کی گئی ہے۔

---

وزیر اعظم نے نیوزی لینڈ میں بسنے والے مسلمانوں کی بالعموم اور سوگوار خاندانوں کی بالخصوص جس طرح دل جوئی کی اور جس طرح انہیں دلاسہ دیا اور ان کے غم میں شریک ہوئیں واقعہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان منافرت سے بھری ہوئی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا تنہا واقعہ ہے۔ اسے دور حاضر کی تاریخ میں ایک نیا موڑ قرار دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ نفرت اور باہمی عدم اعتماد کے اس ماحول میں جب حجاب کا استعمال ایک قابل مواخذہ جرم بن جائے یہ کون تصور کرسکتا تھا کہ ایک سفید فام عیسائی اکثریت کے ملک کی وزیر اعظم دوپٹہ اوڑھ کر متاثرہ خاندانوں کے پاس جائیں گی اور ایک ایک فرد سے گلے مل کر ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار کریں گی۔ یہ بات کس کے حاشیہ خیال میں بھی آسکتی تھی کہ اس ملک کی پارلیمنٹ کا اجلاس تلاوت قرآن سے شروع ہوگا، وزیر اعظم اپنا خطاب السلام علیکم اور حدیث نبویؐ سے شروع کریں گی اور جمعہ کی اذان اور خطبہ سرکاری ریڈیوں اور ٹی وی پر نشر ہوگا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اگلے جمعہ کو وزیر اعظم کی قیادت میں ہزاروں لوگ مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے مسجدوں میں گئے۔ اظہار یکجہتی کے لیے عورتوں نے دوپٹہ اور مردوں نے ٹوپی پہن رکھی تھی۔ طاقتور گن لابی کی موجودگی کے باوجود خودکار ہتھیاروں پر پابندی لگادی گئی۔ ایں چہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب۔ یہ ایک تاریخ ساز لمحہ تھا اور بلاشبہہ اس کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے۔

نفرت اور عداوت سے بھرے ہوئے بیانیہ کے مقابلہ میں یہ ایک بالکل نیا بیانیہ ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ اس کے نہایت دوررس اثرات مرتب ہوں گے اور اس کے زیر اثر باہمی ہمدردی، یکجہتی اور اعتماد کی ایک نئی صبح طلوع ہوگی اور جو خوشگوار ابتدا نیوزی لینڈ میں ہوئی ہے اس کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا۔ یہ سب ایک نیک دل خاتون وزیر اعظم کی نیک نیتی کا ثمرہ ہے۔ عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد۔

---

وزیر اعظم نے پارلیامنٹ میں اپنے بیان میں کہا کہ یہ دہشت گرد شہرت چاہتا تھا لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہوگی۔ ہم اس کا نام نہیں لیں گے۔ وہ ایک دہشت گرد اور مجرم ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی نام نہیں۔ گمنامی اس کا مقدر ہے۔ وزیر اعظم کا یہ احساس اور اس کی بنیاد پر لیا جانے والا یہ فیصلہ یقینی طور پر ان کے اخلاص کا آئینہ دار ہے۔ لیکن پروفیسر حامد دباشی کی طرح ہم بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مسئلہ کے وسیع تر تناظر میں اس فیصلہ کی اصابت محل نظر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس دہشت گرد کو اس کے نام سے پکارا جانا چاہیے تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہو سکے کہ اس نام کے ایک سفید فام عیسائی دہشت گرد نے کتنی بھیانک دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ دہشت گردی اور اسلام ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں۔ ٹوپی، ڈاڑھی اور مسلمانوں کے تشخص سے وابستہ اس طرح کی دوسری علامات کو دہشت گردی کی پہچان میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ سفید فام دہشت گردوں اور دہشت گردی کا ماحول بنانے والوں کا نام دنیا کو بتایا جائے تاکہ ان کے مکروہ چہروں اور ان کے قابل نفرت کارناموں سے دنیا واقف ہو سکے اور یہ داغ مسلمانوں کی پیشانی سے مٹ جائے۔

---

دنیا بھر میں اس حادثہ کی مذمت کی گئی لیکن یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ کم ہی جگہوں پر اس المیہ کے سلسلہ میں اس رد عمل کا اظہار کیا گیا جس کا یہ مستحق تھا۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں طرح کے ممالک شامل ہیں۔ وطن عزیز کو البتہ یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کچھ لوگوں نے اس واقعہ پر خوشیاں منائیں۔ مغربی دنیا میں اینجلا مرکل اور آسٹریلیا کے وزیر اعظم کے علاوہ شاید ہی کسی نے غیر مبہم اور دوٹوک انداز میں اس کی مذمت کی ہو۔ ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گذرے جب جنوری ۲۰۱۵ء میں پیرس میں چارلی ہیبڈو کے آفس پر حملہ کا واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کا سبب آنحضورؐ کے نہایت دلآزار خاکے تھے جو اس میگزین میں شائع ہوئے تھے اور جس سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو شدید اذیت پہنچی تھی۔ اس طرح کے المیوں کے درمیان موازنہ کا

عمل مناسب نہیں لیکن یہ کرائسٹ چرچ کے حادثہ کے مقابلہ میں بدرجہا ایک چھوٹا واقعہ تھا خاص طور سے اس وجہ سے بھی کہ ان بے قصور مسلمانوں نے جن کو گولیوں سے بھون دیا گیا کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ بلکہ وہ تو صرف اللہ کی عبادت کے لیے جمع ہوئے تھے۔ ان کا قصور اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ مسلمان تھے اور خدا کا نام لیتے تھے۔ مغربی دنیا نے چارلی ہیبڈو کے معاملہ کو اظہار رائے کی آزادی کے تقدس کا مسئلہ بنا کر پیش کیا۔ ۱۲/جنوری ۲۰۱۵ء کو صرف پیرس کی سڑکوں پر اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ۷۔۳ لاکھ مظاہرین کا جم غفیر نکل آیا۔ ان کے ساتھ اظہار یکجہتی کے لیے ۴۰ سے زیادہ عالمی حیثیت کے قائدین وہاں پہنچے جن میں کئی ملکوں کے سربراہان سلطنت شامل تھے۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں بشمول مسلم ممالک کے بڑے بڑے مظاہرے ہوئے۔ فرانس کے مسلمانوں نے اس واقعہ کی بھرپور مذمت کی۔ پیرس کے مظاہرین تختیاں اٹھائے ہوئے تھے جن پر لکھا ہوا تھا Je Suis Charlie (میں چارلی ہوں)۔ اس کے بالمقابل اگر دیکھا جائے تو اتنے بڑے دہشت گردانہ واقعہ کے خلاف ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اگر اظہار رائے کی آزادی اتنی مقدس ہے کہ چاہے اس سے کتنے ہی لوگوں کو جراحت پہنچے پھر بھی ہر قیمت پر اس کی حفاظت کی جائے گی تو مذہب کی آزادی جو کسی کے لیے بھی باعث آزار نہ ہو اس کی حفاظت کیوں نہ کی جائے۔ لیکن پچاس مسلمانوں کے سفاکانہ قتل کے خلاف اس کا دسواں حصہ کا بھی مظاہرہ کہیں نہیں ہوا۔ اس پس منظر میں نیوزی لینڈ کی وزیر اعظم اور وہاں کے باشندوں نے جو کچھ کیا وہ لائق صد آفرین ہیں۔ ہر حادثہ میں مواقع بھی ہوتے ہیں اور امکانات بھی۔ کرائسٹ چرچ کا یہ المیہ اور وہاں کی حکومت اور باشندوں کا ردعمل امت مسلمہ کو ایک موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کا دنیا بھر میں اور خاص طور سے مغرب میں تعارف کرائیں اور بتائیں کہ یہ مذہب ایسا نہیں ہے جس سے نفرت کی جائے بلکہ یہ تو ایسا ہے کہ اس کو گلے لگایا جائے۔ سچ یہ ہے مغرب کی بڑی اکثریت اسلام کے سلسلہ میں صرف وہی باتیں جانتی ہے جو مخالفین نے ان کو بتائی ہیں۔ اب اس کمی کو دور کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ کام وہی لوگ زیادہ موثر طور پر انجام دے سکتے ہیں جو وہاں آباد ہیں۔ شاید وہ اسی لیے وہاں پہنچائے گئے ہیں۔ اہل مغرب کی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ انہوں نے ان پناہ گزینوں کے لیے اپنے ملک اور کئی مرتبہ اپنے گھروں کے بھی دروازے کھول دیے جبکہ ترکی کے علاوہ بیشتر مسلمان ممالک کے دروازے ان کے لیے بند ہی رہے۔

# مقالات

## معارف سیرت۔ایک محاکمہ

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

بہت آسان کام تھا کہ اشاریہ معارف کی مدد سے معارف دارالمصنّفین میں گزشتہ ایک صدی میں چھپنے والے مقالات سیرت کو ان کی اشاعت کی ترتیب تاریخی سے مرتب کردیا جاتا۔اس پر محاکمہ بھی دشوار نہ ہوتا۔لیکن معارف سیرت کی قدرو قیمت اور معارف دارالمصنّفین کی عطایائے سیرت کا صحیح تجزیہ نہ ہوسکتا۔اس لیے مختلف موضوعات ومضامین اور مباحث سیرت کے حوالے سے دونوں کی قدرو قیمت آنکنے کا کام موزوں معلوم ہوا۔یہ صرف طبیعت دشوار پسند کا معاملہ نہیں،سیرت نگاری کی تربیت فنی اور تجزیہ ومحاکمہ کی طبیعت نوعی کا بھی تقاضا ہے۔عناوین وموضوعات کی ترتیب مختلف ہوسکتی ہے کہ وہ ذاتی انتخاب اور درجہ بندی کی چیز ہے،خاکسار راقم نے اپنے طویل مطالعہ سیرت اور جاں گسل نگارش سیرت کے تجربہ وتجزیہ سے بہتر سے بہتر ترتیب اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔یاران ہمہ دان کو صلائے عام ہے اور صدائے خاکسار بھی کہ وہ اس سے بہتر وبرتر ترتیب عناوین قائم کریں کہ سخنور کہتے ہیں سب سے بہتر سہرا۔

محاکمہ معارف سیرت دارالمصنّفین میں ایک جاں کاہ اور وقت وصبر طلب تجربے سے بھی گزرنا پڑا۔وہ یہ کہ تمام معارف سیرت کے عنوانات کو ان کے مضامین ومشمولات سے ملاکر دیکھا اور ان کے نکات ومباحث کے اصل مغز کو اپنے تجزیہ وتحلیل میں مختصراً دکھانے کی کوشش کی،وہ سعی مشکور ثابت ہوئی نہ صرف معارف سیرت سے قلب وذہن کی مالداری کے حوالے سے بلکہ معارف دارالمصنّفین کے صدسالہ بلا انقطاع عطائے گہربار رسالت کے قرینے سے بھی۔خاکسار راقم نے اخیر اخیر میں اپنے تنقیدی تبصروں اور فنی ملاحظوں سے خود کو باز نہ رکھا کہ وہ محنت ومطالعہ کا ثمرہ تھا اور اسی کے ساتھ تجزیاتی و علمی دیانت کا تقاضا بھی۔ان اشاراتی تبصروں اور اپنی فہم وتحلیل کے مطابق تنقیدوں میں خاکسار راقم کو

پروفیسر،صدر،ڈائریکٹر(سابق)ادارہ علوم اسلامیہ وشاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل،مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ۔

نہ شرمساری ہے اور نہ معذرت طلبی کی رسمی خواہش کہ وہ علمی روایت آباء ہے۔ مدلل مداحین اور جانبدار تجزیہ نگاروں کی جبین طرفگی اور روئے طرفداری پر ضرور شکنیں پڑیں گی کہ وہ اپنے ممدوحین کی نگارشات تو کیا تسامحات واغلاط کو حق بجانب قرار دیتے ہیں خواہ اوراق سیرت مطہرہ پر غلط بیانی کے سیاہ دھبے لگ کر انہیں داغدار کردیں۔ وہ اپنے بزرگوں اور اکابر کی سنتِ نقد و تصحیح تک فراموش کر دیتے ہیں۔

مقالات سیرت کی ترتیب میں اصل مصادر سیرت نبوی کو اولیت دی گئی ہے اور ان میں سرفہرست عمومی جائزہ کو رکھا گیا ہے اور خاص مصادر کو ان کے بعد ثانوی مصادر میں بھی یہی عمومی اور خصوصی تفریق ہے۔ معارف سیرت میں ایک خاص نوع ہندوستان میں محفوظ مخطوطات و مطبوعات عمومی اور خصوصی کی دوگانہ تقسیم کی گئی ہے۔ جدید سیرت نگاری میں مسلم اور غیر مسلم اہل قلم کے مقالات کو الگ الگ خانوں میں رکھا گیا ہے تا کہ اپنوں اور غیروں کے سیرتی کاموں کا تجزیہ و موازنہ بھی ہو جائے۔ غیر مسلم سیرت نگاروں میں بوجوہ کمیت و کیفیت مستشرقین کے سیرتی مقالات کا ہے کہ وہ بھی رسول رب العالمینؐ کے امتی ہیں اور مدح خواں بھی۔ ان کا تیسرا زاویہ ہندو سیرت نگاروں کی کتب و مقالات کا ہے کہ وہ بھی امت محمدیہ کے طبقہ دعوت میں شامل ہیں۔ خاص سیرت نبوی کے تعلق سے مقام و منزلت رسالت پر مبنی مباحث و مقالات کو بوجوہ سرفہرست رکھا گیا ہے کہ ادارہ نبوت کے آغاز و تسلسل کے گواہ ہیں۔ سوانحی واقعات میں تاریخی ترتیب اور فنی درجہ بندی کے لحاظ سے مکی دور کے واقعات و سوانح میں، خواہ وہ شخصی ہوں یا سماجی روایات کے زائیدہ، مضامین کو سرفہرست رکھا گیا۔ دعوت نبوی اور اس کے مختلف ردعمل خصوصاً منفی اور مخالفانہ کے مقالات آئے ہیں اور ان کے بعد تعمیر امت اسلامی کے عنوان کے تحت مقالات آئے ہیں جو دعوت کے ثمرات تھے۔ ہجرت مدینہ سے سیرت نبوی کا مدنی دور شروع ہوتا ہے۔ اول وہ مباحث و مقالات رکھے گیے ہیں جو شہر یثرب، اس کے آثار اور قبائل عرب و یہود سے متعلق ہیں۔ غزوات نبوی اس کے ساتھ شروع ہوئے اور ان کے بعد سوانحی واقعات خصوصاً اخیر عہد کے واقعات پر مشتمل مباحث لائے گئے ہیں۔ اندرون ملک قبائل اور بیرون ملک اقوام و اکابر سے تعلقات کا باب دعوت اسلامی اور تعمیر امت دونوں کا ہے۔ مجموعی مباحث سیرت میں احادیث و اقوال نبوی، سوانحی واقعات و روایات، معجزات، سیرت صحابہ و صحابیات کے حوالے سے سیرت نبوی میں عام صحابہ اور ازواج مطہرات کے مقالات ہیں۔ علوم وفنون کے

مبحث میں نظام تعلیم، تدوین قرآن وحدیث اور پرورش شعروادب پر مباحث ہیں۔

اصل مصادر سیرت نبوی: عمومی نظر و جائزہ پر مبنی مقالات و معارف سیرت میں شامل کئی نگارشات ہیں۔ان سب میں جائزانہ مماثلت اور عمومی طائرانہ نظر کا عنصر ملتا ہے۔

۱۔فن سیرت نگاری اور تاریخ نگاری کے اصول پر دو مقالات ہیں اور مظہر الاسلام قاسمی کا مقالہ متوسط دور کے مورخین کے بعض مباحث سے تعرض کرتا ہے جیسے تاریخ، درایت کا فرق واصول وغیرہ، قدیم سیرت نگاروں کے حوالے سے روایت پرستی، کذب بیانی اور نقل بلا عقل، شرائط مورخ اور علت و معلول کی تلاش وغیرہ میں شبلی سے کسب فیض کرنے کے علاوہ ماٰخذ سہ گونہ مضبوط، منقولہ وقدیمہ گنا تا ہے، اس کا فن سیرت نویسی سے دور کا تعلق ہے اور ثانوی ماٰخذ پر مبنی ہے، فن سیرت نگاری سے اصطلاحی سیرت نگاری کا دھوکہ ہوتا ہے جو سید سلیمان ندوی کا تلخیص وتبصرہ کا مختصر مقالہ ہے۔وہ اصلاً سوانح عمری کے اصول سے تعرض کرتا ہے۔اصولی مباحث سیرت نگاری کے بس یہی دو مضمون ہیں۔(معارف ۱۷۳/۶/جون ۲۰۰۴/ ۵۰/۶/دسمبر ۱۹۴۲ء)

۲۔تاریخی آغاز وارتقائے فن سیرت نویسی سے متعلق کئی مقالات علماء واکابر ہیں۔سید سلیمان ندوی کا مقالہ ''احادیث وسیر کی تحریری تدوین'' ان کی وضاحت کے مطابق ان کے خطبات مدراس کا تیسرا خطبہ ہے۔اس کے عمومی مباحث ہیں: علم اسماء الرجال، صحابہ کی احادیث وروایات، عربوں کی قوت حفظ، تحریر کا آغاز اور ارتقا، عہد نبوی کا تحریری سرمایہ، خطبات ومراسلات پر مشتمل ہے۔ امام زہری اور ان کے بعض جانشینوں کا ذکر بھی عمومی نوعیت کا ہے۔وہ قدیم ترین مقالہ ہونے کے سبب خاصا اہم ہے، خطبات مدراس سے موازنہ سے ان کی افادیت وقدامت کا مزید پتہ چلتا ہے۔(معارف ۱۷/ ۲/فروری ۱۹۲۶ء)

مولانا تقی الدین ندوی کے مقالہ ''سیرت نبوی کے اولین وقدیم ماٰخذ'' تابعی کاتبین ومولفین سیرت اور ابن اسحاق وابن ہشام جیسے اماماں سیرت سے قرون وسطی یا بقول شبلی متاخرین کی مساعی کو شامل کیا گیا ہے اور ان کی سوانح و کتب سیرت کو غیر فنی انداز سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ان کے تسامحات اور فروگزاشت پر محمد اجمل اصلاحی نے نقد کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ مقالہ نگار نے متعدد قدیم مولفین مغازی کا ذکر نہیں کیا اور متاخرین کی اہم ترین کتابوں سے اعتنا نہیں کیا اور بعض واقعاتی

غلطیاں کی ہیں۔(معارف ۱۲۷/ ۶ر جون ۱۹۸۱ء/ ۲ر اگست ۱۹۸۱ء)

اسی نوع کا مقالہ محمود الحسن عارف کا ہے جو پہلی صدی میں سیرت نگاری کا ارتقاء دکھاتا ہے اور خاتمہ مغازی ابان بن عثمانؓ پر کرتا ہے۔اس مقالہ میں سیرت، حدیث، غزوہ، سریہ کا فرق وغیرہ کے مباحث غیر متعلقہ چیزیں ہیں اور اولین کتب اور ان کی دقتیں اور علم الحدیث کے زیر سایہ فن سیرت کا ارتقاء ان کے طرز فکر کی غماز ہیں۔حضرت عروہ بن زبیر اور ابان بن عثمان کے بیان میں وہ سوانح اور جدید اہل قلم کے اقتباسات کے سبب ایک کھتونی بن کر رہ گیا ہے اور خاصا غیر تحقیقی ہے۔(معارف ۱۹۱/ ۶ر جون ۲۰۱۳)

''مدینہ میں تدوین سیر و مغازی (پہلی صدی کے نصف آخر میں)'' قاضی اطہر مبارکپوری کا طویل مقالہ ہے جو اولین صاحبان مغازی کی فہرست میں بہت اضافہ کرتا ہے اور دستیاب مصادر میں ان کی روایات کی نشاندہی اس کا طرہ امتیاز ہے۔

''سیرت نگاران نبوی (بنو امیہ اور بنو عباس کے عہد میں)'' شیخ نذیر حسین کا مقالہ حضرت سعد بن عبادہ خزرجیؓ، فرزند حضرت سعیدؓ اور ان کے پوتے شرحبیل کا ذکر اضافہ ہے۔ان کے مقالہ میں اماماں حدیث و سیر اور قدیم مولفین اور متوسط و متاخر رواۃ و مولفین میں سے متعدد کا ذکر دسویں صدی عیسوی تک ممتد ہے اور متعدد نئے صاحبان مغازی سامنے لاتا ہے۔ان کے مقالہ کا سب سے اہم افادی اور تحقیقی پہلو یہ ہے کہ ان کے اقتباسات و روایات مشہور کتب و تاریخ میں ملنے کی نشاندہی کرتا ہے یا ان سے استفادہ کی تحقیق کرتا ہے۔(معارف ۱۵۲/ ۲۔۳: اگست ستمبر ۱۹۹۳ء)

''مفقود مصادر سیرت'' کے عنوان سے اپنے مقالہ میں جمشید احمد ندوی نے تین طبقات کا ذکر کیا ہے۔وہ سب معروف سیرت نگار ہیں یا قدیم ترین مولفین مغازی۔عروہ بن زبیر کی کتاب المغازی کی ایک روایت ابوالاسود چھپ گئی ہے۔موسیٰ بن عقبہ کی کتاب سیرت مفقود ہے مگر ان کی بہت سی روایات کو خود مقالہ نگار نے جمع کیا ہے اور ابن اسحاق کی کتاب کی ایک روایت بکائی ابن ہشام میں موجود ہے اور واقدی کی کتاب کا آخری حصہ کتاب المغازی میں چھپ چکا ہے۔بعض قطعات سیرت ابن اسحاق بھی منظر عام پر آ گئے ہیں لہٰذا وہ سب کلیتاً مفقود نہیں ہیں۔(معارف ۱۹۰/ ۴۔۵: اکتوبر نومبر ۲۰۱۲ء)

۳۔فن تراجم وطبقات پر مولانا عبدالسلام ندوی کا علمی مقالہ اولین معروف مولفین سیرت اور مصنّفین طبقات سے تعرض کرتا ہے اور وہی سیرت سے متعلق ہے۔باقی دوسرے علوم سے کرتے ہیں۔ (معارف ۱۲ / ۲رستمبر ۱۹۲۳ء)۔

بعض مصادر سیرت نبوی کا جائزہ ایک عربی مصنف کے مقالہ عربی کی تلخیص شدید ہے اور صرف اسمائے گرامی گنانے تک محدود ہے۔ان سے علم دستیاب میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔(معارف ۱۹۰ / ۵رنومبر ۲۰۱۲ء)۔

۴۔جائزہ عمومی کے تحت جن مصادر ومباحث کا ذکر معارف کے مقالات میں آیا ہے وہ قابل قدر ہونے کے باوجود شے مستعار لگتے ہیں۔ان سے بہتر اور تحقیقی اور علمی مقالات اور جائزے بعض مستشرقین کے ہیں اور ان کے اردو تراجم بھی چھپے ہیں۔ وہ بیشتر انھیں سے ماخوذ ومستفاد ہیں سوائے شیخ نذیر حسین کے مقالہ کے۔بعض عمومی جائزے کسی اور کتاب کے ابواب میں سے ایک باب ہونے کے سبب بھی محدود افادیت وکمتر علیت کے حامل ہیں۔ان میں سے قدیم ترین مقالات البتہ مساعی مشکورہ ہیں۔

۵۔خاص مصادر سیرت یا مولفین کتب سیرت پر مشتمل مقالات معارف گوناگوں بھی ہیں اور علمی وتحقیقی جہات کے حامل بھی اور نقص وخلا یا عدم تعرض کے شکار بھی۔مقالہ نگار حضرات میں ہمارے دور کے جید علمائے کرام بھی شامل ہیں اور ممتاز محققین بھی، دانشوران کرام بھی ہیں اور اساتذہ جامعات ومدارس اور مدیران معارف بھی۔تجزیہ وتحلیل اور محاکمہ کی میزان عدل وقسط میں ان کے مقام وقدر وقیمت نگارشات کی ایک سعی ان کی خصوصیات وامتیازات اور تعصّبات وافکار کو سامنے لاتی ہے۔

مشہور اہل قلم چودھری غلام احمد پرویز کا طویل مقالہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم قرآن کی روشنی میں“ اصلاً منصب رسالت پر فائز چیدہ ترین بندگان الٰہی کے منصبی فرائض سے بحث کرتا ہے اور ان پر وارد کیے جانے والے اعتراضات کا ازالہ کرتا ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرائض منصبی کا بھی ذکر آیا ہے مگر وہ قرآنی سیرت نگاری سے قطعی غیر متعلق ہے۔(معارف ۳۵ / ۳۔۴رمارچ۔اپریل ۱۹۳۵ء)

عہد قدیم کے معتبر وعہد ساز امامان سیرت میں موسیٰ بن عقبہ کی کتاب سیرت یا المغازی کو قبول عام بھی ملا اور امت اسلامی کے قریب قریب تمام اکابر کا اعتبار ودوام بھی۔جمشید احمد ندوی کا مقالہ ان

کے شخصی سوانح وکمالات کے علاوہ ان کی روایات سیرت کی بازیافت کی ایک اچھی کوشش ہے جو مختلف مصادر سے اخذ وقبول کے ذریعہ کی گئی ہے۔ وہ نقد وتجزیہ سے بہر حال عاری ہے کہ ان روایات بازپسین سے سیرتی ادب میں ان کے عطایا کی قدر وقیمت متعین نہیں کرتا۔ (معارف ۱۵۸ / ۲/ اگست ۱۹۹۶ء)

''ابومعشر نجیح سندی صاحب المغازی'' پر محقق کبیر قاضی اطہر مبارک پوری کا تحقیقی مقالہ ان کے سوانح حیات سے زیادہ اور سیرتی ادب میں ان کی خدمات وکردار سے کم تعرض کرتا ہے۔ سیر ومغازی میں ان کی مفقود کتاب المغازی کی روایات کا تجزیہ بھی نہیں کیا گیا اور نہ ان کی قدر وقیمت پر بحث کی گئی۔ ائمہ جرح وتعدیل کے اقوال سے بحث وفیصلہ ایک جانبدارانہ کام ہے۔ اپنے استدراک یا وضاحت میں ظفر احمد صدیقی نے صرف ان کے نام نامی نجیح بروزن امیر کا اثبات مصادر حدیث وعلم الرجال سے کیا ہے، بعض مقالہ نگاروں نے اسے مجہول مصغر بنا دیا تھا۔ (معارف ۱۷۸ / ۳۔ ۴/ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء/ ۱۸۷ / ۱/ جنوری ۲۰۱۱ء)۔

عظیم سیرت نگار اور جامع سیرۃ النبی اور محقق عالم دین سید سلیمان ندوی کا امام سیرت امام واقدی پر دو قسطوں میں طویل مقالہ بھی علم اسماء الرجال کے ماہرین کے اقوال وآرا کی بنیاد پر ان کی جرح یا تعدیل کا فیصلہ کرتا ہے۔ حضرت سید کے استدلال کا تضاد یا کشاکش یہ ہے کہ وہ مشہور وعظیم ترین محدثین وماہرین کے اقوال جرح کی بنا پر کم مشہور اور فروتر مقام کے مالک محدثین ومورخین واہل سیر کے اقوال تعدیل کو مسترد کرتا ہے۔ سوال اور بحث ابھی باقی ہے کہ خاصی بڑی تعداد میں محدثین واہل سیر ان کی ثقاہت ہی نہیں امامت فن کے قایل ہیں۔ محققین نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ متعدد ناقد محدثین و ائمہ جرح نے ان کی کتاب المغازی سے استفادہ کیا اور عام اہل سیر تو ان کی فن سیرت میں معتبریت و فنکاری کے معترف ہیں۔ سید موصوف کا استدلال علمی دلائل سے زیادہ ان کے اور ان کے استاذ گرامی کے خیال خام کے پایہ چوبیں پر قائم ہے۔ سیرت النبی میں خود ان دونوں امامان سیرت نے ان کی روایات لی ہیں۔ حضرت سید اور ان کے استاذ ہی نہیں معدودے چند اہل قلم کے سوا تمام تر جدید سیرت نگاروں نے امام واقدی کے لیے غیر مہذب اور جارحانہ لہجہ اور زبان وبیان اختیار کیا ہے اور یہ واضح ہے کہ ان ناقدین جانبدار نے سخن شناسی کا ثبوت نہیں دیا، صرف عصبیت علمی کا مظاہرہ کیا اور نہ ہی انھوں نے کتاب المغازی کے متن کا محققانہ علمی، تحقیقی مطالعہ کیا ہے۔ (معارف ۱۷ / ۱: جنوری ۱۹۲۶ء/ ۱۹ /

۲؍جنوری ۱۹۲۷ء)

''علامہ واقدی۔فن سیر کے امام'' کے عنوان سے اپنے مقالہ میں ظفر احمد صدیقی نے عظیم امام سیرت کے ساتھ انصاف کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ان کا استدلال یہ ہے کہ وہ فن حدیث میں متروک وضعیف ہوسکتے تھے مگر فن سیرت میں امام دوئم تھے امام ابن اسحاق کے بعد۔موصوف نے بھی علمائے محدثین اور سیرت نگاروں کے اقوال وآرا کے ڈھیر لگادیے ہیں لیکن ان کا مثبت اور علمی افادہ یہ ہے کہ اماماں سیرت میں ابن سعد سے زرقانی تک اور اماماں حدیث میں عسقلانی وعینی سمیت جدید شارحین حدیث تک سب نے ان کی روایات سیرت قبول کی ہیں۔متن کتاب المغازی کا غائر مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ حدیث کے فن میں بھی امام مالک کے ہم پلہ نہ سہی مگر اتنے بودے بھی نہ تھے کہ متروک سمجھے جائیں،بازیافت واقدی کا مشکل کام ابھی آنا باقی ہے۔(معارف ۱۸۹/۵؍نومبر ۲۰۱۰ء)۔

امام واقدی پر کلیم صفات اصلاحی کا مقالہ دراصل ایک عرب اہل قلم ڈاکٹر عبدالعزیز بن سلیمان السلومی کے تحقیقی مقالے کے مباحث پیش کرکے ایک نئی جہت کی بازیافت دکھاتا ہے۔ (معارف ۱۸۹۔۱۹۰،جون وجولائی ۲۰۱۲ء)

ابن سعد کی طبقات پر سعود عالم قاسمی کا مقالہ حسب معمول علماء سوانح وحالات اور آراء واقوال ناقدین وماہرین کے بعد ان کی ثقاہت پر جمہور کی اجماعی فضیلت بیان کرتا ہے۔طبقات وتراجم کی نوعیت سے بحث کرتا ہے مگر ان کی سیرت نگاری سے بالکل پہلوتہی کرتا ہے۔ابن سعد کے مصادر میں صرف واقدی کی روایات ہی نہیں اوروں کی بھی پائی جاتی ہیں اور ان دونوں میں صحیح وضعیف اور راجح و مرجوح بلکہ منکر روایات کا توڑ نہیں ہے۔سیرت نگاری ابن سعد کا کام اور اس کا تجزیہ ابھی معارف کی حد تک باقی ہے۔(معارف ۱۸۶/ ۴:۱ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

بلاذری کی فتوح البلدان کا مطالعہ اور اس پر مبنی کلیم صفات اصلاحی کا مقالہ سوانح بلاذری اور اسلوب ومصادر کے علاوہ مباحث کتاب سے تعرض کرتا ہے لیکن عہد نبویؐ کی فتوح سے کم تعرض کرتا ہے۔بہرحال اس میں مسجد نبویؐ/مسجد قبا اور اولین دور نبویؐ مدنی کے واقعات،عمال کی تقرری وکارکردگی کا ذکر موجود ہے لیکن تجزیہ وتحلیل سے معرا۔(معارف ۱۸۷/ ۶؍جون ۲۰۱۱ء)

قاضی عیاض کی کتاب الشفاء پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا طویل مقالہ ادب سیرت میں اس

کی نوعی حیثیت ابن قیم کی زادالمعاد کے مماثل قرار دیتا ہے جو سوانحی ترتیب کے برخلاف سیرت نبویؐ کا مطالعہ اتباع سنت کے زاویہ سے کرتی ہے، صاحب کتاب کے سوانح واحوال اور کتاب شفاء کے ابواب ومباحث کا تجزیہ ماخذ اور کلامی وفقہی مباحث سے کرتی ہے۔ چیدہ موضوعات ومباحث کے زیر بحث لانے کے سبب کتاب الشفاء کی سیرتی ادب میں مقام ومنزلت اور عطیہ وکردار اور اضافہ و ندرت سے بحث کرنے میں مقالہ قاصر رہا ہے۔ مولانا علاء الدین ندوی کا اس کتاب پر مقالہ مذکورہ بالا کے مباحث سے آراستہ ہے اور کتاب الشفاء کے چار پانچ شاہ نمونوں سے ظاہری وباطنی کمالات نبوی اور معجزات نبویؐ وغیرہ سے تعرض کرتا ہے سیرت نبویؐ میں اس کی مصدریت، معتبریت وافادیت کا مبحث تلخیص شدید کی وجہ سے قاصر وناقص رہ گیا۔ (معارف ۱۲۵/۱-۴: جنوری-اپریل ۱۹۸۰ء/ ۱۹۲/۳/ستمبر ۲۰۱۳ء)

شمائل ترمذی کی شرح مناوی پر ایک مختصر مقالہ صرف اس کے ایک مخطوطہ کے تعارف تک محدود ہے۔ معارف کے مبصر نے البتہ اس کی شروح کا مزید ذکر کیا ہے۔ مباحث کتاب یا مباحث سیرت سے دور کا واسطہ نہیں ہے۔ (معارف ۶۱/ ۵: مئی ۱۹۴۸ء)

ابن سید الناس کے رسالہ/مختصر نور العیون کا اصل ماخذ مقالہ نگار کی تحقیق وتجزیہ میں محب الدین طبری کا خلاصہ سیر سید البشر ہے نہ کہ مختصر نگار کی کتاب مفصل عیون الاثر کا جیسا کہ عام خیال ہے اور جس سے ابھی تک علمائے کرام اور جید اہل سیر پیچھا نہ چھڑا سکے۔ وہ ایک تحقیقی وتجزیہ مصدر سیرت کا مقالہ ہے اور تنقیدی بھی۔ اس کے عربی متن مختصر سیرت کا فارسی ترجمہ سرور المحزون از شاہ ولی اللہ دہلوی مذکورہ مقالہ نگار کا دوسرا متعلقہ حصہ ہے جو فارسی ترجمہ اور عربی متن کے مابین موازنہ کرکے ترجمہ شاہ کی اغلاط و تسامحات اور اضافات وافادات کو واضح کرتا ہے اور ترجمہ متن کے لیے ایک اصولی بحث سامنے لاتا ہے۔ (معارف ۱۸۸/ ۵: نومبر ۲۰۱۱/ ۱۸۶/ ۲/اگست ۲۰۱۰ بالترتیب)

دمیاطی کی مختصر کتاب سیرت المختصر فی سیرۃ نبی البشر اصلاً ڈاکٹر عتیق الرحمٰن قاسمی کے مخطوطہ خدابخش لائبریری کے مقالہ پر استدراک ہے کہ خدابخش کا مخطوطہ واحد نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے مخطوطات بھی عالم عرب کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور ان کی بنا پر ڈاکٹر محمد الامین کی تحقیق سے وہ مختصر دمیاطی شائع بھی ہو چکا ہے۔ (معارف ۱۸۶/ ۶: دسمبر ۲۰۱۰ء)

سیرت شامی پر شیخ نذیر حسین کا مقالہ دراصل اس کی جلدوں کی طباعت سے متعلق ہے اور اس ذیل میں کتاب زیر بحث کے مصادر اور مطبوعہ مجلدات اربعہ کے مباحث سیرت کا تعارف پیش کیا ہے اور ان کا تجزیہ نہیں کیا۔انھوں نے حلبی کی شرح ونقد شامی کا حوالہ بھی نہیں دیا جو نوید احمد شہزاد نے اس پر نقد کے حوالے سے دیا ہے اور صرف یہ تعارف ہے کہ وہ سیرت شامی کی شرح ہے اور شارح حلبی نے قابل قدر اضافات کیے ہیں اور ان میں بعض روایات پر نقد ہوتا رہا ہے۔باقی تفصیل صرف ان کی طباعتوں سے متعلق ہے۔(معارف ۱۲۸ / ۵رمئی ۲۰۱۱ء)

''تاریخ طبری میں سیرت نبوی کے مآخذ''میں مقالہ نگار نے اس کے مآخذ کی روایات کا سراغ لگایا ہے۔امام ابن اسحاق کی روایت سلمہ بن الفضل الابرش بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور ان کی روایات کو سیرت کے مباحث میں باب بہ باب متعین کیا ہے اور اس طرح دوسرے مصادر سیرت طبری جیسے ابن الکلبی، ابوعبیدہ، معمر بن مثنی، واقدی اور ابن سعد کی روایات کا اپنے شیخ ابن حمید کے واسطے سے نشاندہی کی ہے۔وہ تجزیاتی مقالہ ہے اور مصادر سیرت کی تحقیق وتلاش میں کئی جہات کا اضافہ کرتا ہے۔(معارف ۱۸۶۔۱۸۷: دسمبر ۲۰۱۰ء جنوری ۲۰۱۱ء)۔

سیرت حلبیہ پر کی گئی تنقید کا جائزہ نوید احمد شہزاد نے لیا ہے اور تنقید کے عناوین خاص ہیں: ترتیب مضامین بے مہار، ناقص معلومات، متصوفانہ عقائد کی آمیزش، مآخذ کا ابہام، شافعی مسلکیت وغیرہ۔یہ نقد سیرت حلبیہ کی اردو طباعت از محمد مسلم قاسمی پر ہے۔(معارف ۱۸۷/۳رمارچ ۲۰۱۱ء)

مصادر اصلی پر مقالات ومعارف سیرت کی بحث میں محاکمہ قدرے تفصیل سے بوجوہ کیا گیا ہے۔ان میں سے اہم ترین یہ ہے کہ ان ہی مصادر اصلیہ پر ہماری اور سب کی سیرت فہمی اور سیرت نگاری منحصر ہے۔تنقیدی تبصروں میں ادب سیرت کی بازیافت وجستجو اصل مقصود نظر رہی ہے۔ روایتی علمائے کرام اور غیر ماہر مورخین بالعموم سوانح واحوال پر زیادہ زور دیتے ہیں اور سیرت نبویؐ کی نگارش، ترسیل وتحفیظ میں ان کی قدر وقیمت اور کردار کا تعین کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔دوسروں کی آراوافکار اپنی جگہ اہم ہیں مگر وہ اصل مصادر کے متون وروایات سیرت کا بدل نہیں ہوسکتے۔روایات سیرت کسی کتاب ومصدر میں ہوں سب کی سب صحیح نہیں ہوتیں، نہ تمام غلط۔ان کا تجزیہ خالص صرف متون فہمی سے ہوسکتا ہے۔معارف کے مقالات مصادر سیرت اپنی جگہ بہت اہم ہیں مگر قابل نقد و

استدراک بھی ہیں کہ وہ شخصی تعصّبات کے علاوہ عمومی تجزیہ نگاری اور روایتی نگارش کے حامل ہیں۔تعداد کے لحاظ سے بھی وہ کافی کم ہیں اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ متعدد اماماں سیرت جیسے ابن اسحاق و ابن ہشام اور متاخرین میں اپنی جگہ امامت فن پر فائز کاملین و محققین سیرت جیسے سہیلی، قسطلانی، زرقانی وغیرہ پر ایک بھی مقالہ اوراق معارف میں بار نہ پا سکا۔معارف انہیں لکھوانہ سکا اور مقالہ نگاروں کو توجہ نہ ہوئی۔

(ب) جدید/ثانوی مصادر سیرت میں صرف چند مقالات معارف میں شائع ہوئے۔ان کی قدر و قیمت آ نکنے سے قبل اہل علم کی ان کی طرف سے بے توجہی کا شکوہ بیجا ضرور ہے مگر ہے۔ان میں سے چند سیرت نگاران برصغیر کے کارناموں سے متعلق ہیں اور ایک دو عالم اسلام میں سیرت نگاری کی کاوشوں کا عمومی جائزہ لیتے ہیں اور ایک آدھ عصر حاضر کے اسلوب جدید اور زمانی و ملی تقاضوں کی رعایت سے لکھے گئے ہیں۔ان کا ایک تجزیاتی محاکمہ ان کی گوناگوں انواع سے کیا جاتا ہے اور خاص سیرت نگاران جدید سے آغاز کیا جاتا ہے۔

سیرت نبویہ مصنفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ پر شیخ نذیر حسین کا مقالہ مصنف گرامی کی خدمات سیرت کے عمومی جائزے اور فرانسیسی زبان میں مصنفہ سیرت نبویہ کے ابواب و مباحث کی کھتونی کرتا ہے اور یہ نہیں بتاتا ہے کہ اس کی امتیازی دین کیا ہے۔وہ مصنف گرامی کی عطا کردہ نئی معلومات، روایات و اخبار کی بحث و تحلیل اور ان کے خاص تفردات سے ذرا بھی تعرض نہیں کرتا، وہ ایک سطحی مطالعہ ہے۔ (معارف ۸۸/ ۱، جولائی ۱۹۶۱ء)۔

خالد مسعود کی حیات رسول امی پر باب التقریظ والانتقاد میں نوجوان تجزیہ نگار توقیر احمد ندوی نے مذکورہ بالا کے برعکس مصنف مرحوم کی سیرت نگاری کے امتیازات و تفردات سے بحث کی ہے۔ اولین حصہ نقد میں عام و مشہور روایات و مسلمات سیرت کے برخلاف یا بقول ان کے جمہور کے فکر و اجماع کے خلاف خالد مسعود کی ان بحثوں کو پیش کیا ہے جو ان کی تحلیل میں نئی اور منفرد نظر آتی ہیں۔ دوسرے حصہ انتقاد میں کتاب لطیف کے خصائص سے بحث کی ہے جیسے آیات قرآنی کی روشنی میں تالیف سیرت کا دعویٰ، پیش رو کتب سیرت میں بلا نقد روایات قبول کرنے کا ادعا، کفالت نبوی میں حضرت زبیر کا حصہ، اولین تنزیل قرآنی سورہ مدثر، اسلام حضرت عمرؓ کی مشہور روایت کی تغلیط اور

حضرت خدیجہؓ وحضرت عائشہؓ کی عمروں میں روایات پر نقد واستدراک۔ مصنف فکر فراہی کے علمبردار تھے اور اس کے مبلغ۔ (معارف ۱۷۳/۵: مئی ۲۰۰۴ء)

باب التقریظ والانتقاد میں ہی محمد عارف عمری نے محمد یسٰین مظہر صدیقی کی کتاب عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت پر نقد وتبصرہ اور مدح وقدح سے آراستہ کیا ہے۔ وہ اصلاً دوسرے نوع کی کتاب ہے۔ (معارف ۱۵۴/۱: جنوری ۱۹۹۹ء)

سید ابوالحسن علی ندویؒ کی عربی تالیف السیرۃ النبویہ اور اس کے اردو ترجمہ نبی رحمتؐ اور مختلف طباعت پر مولانا ضیاالدین اصلاحی نے مولف گرامی کی مداحی اور کتاب کی تحسین وتعریف میں مبالغہ روا رکھا ہے۔ ابواب ومباحث کی تفصیل دینے کے علاوہ بعض خصائص کتاب جیسے مکہ مدینہ کی شہری حیثیت، بعض الفاظ واصطلاحات کی لغوی تحقیق اور شکوک وشبہات کا ازالہ اور واقعات سیرت سے عبرت ودرس وموعظت کو پیش کیا ہے مگر کتاب سیرت کی اغلاط وتسامحات اور تحقیق وتجزیہ روایات کے فقدان پر کوئی نقد وتبصرہ نہیں کیا کہ خیال خاطر شیخ مانع تھا۔ (معارف ۱۴۲۔ ۱۴۳/ ۶،۲ دسمبر ۱۹۸۸ء جنوری ۱۹۸۹ء/ نیز معارف ۱۲۳/۲: فروری ۱۹۷۹ء تبصرہ، ع ق پر مذکورہ بالا)

نعیم صدیقی پر ایک مداح عبداللہ شاہ ہاشمی کا مقالہ ہے جو انھیں انقلابی اور منفرد سیرت نگار قرار دیتا ہے۔ وہ مصنف گرامی کی تین چار کتب سیرت کا حوالہ دے کر صرف محسن انسانیت کے مباحث وخصائص سے بحث کرتا ہے۔ اسلام و بعثت ورسالت محمدی ایک انقلابی تحریک، آفاقی تہذیب کی بانی اور سیاسی پہلو انقلاب کو امتیازات میں شمار کیا ہے۔ مصنف کی ادبی منزلت اور ان کے جاندار ادبی اسلوب اور دل پذیر استدلال کو اقتباسات کے ذریعہ ابھارا ہے۔ ایک عمدہ مقالہ ہونے کے باوجود صرف تحسین وتعریف کا پہلو رکھتا ہے اور نقد وتجزیہ سے عاری ہے۔ (معارف ۱۸۱/۵: مئی جولائی ۱۹۹۲ء)

باقی مضامین ومقالات اس نوع میں محض تعارفی نوعیت کے ہیں جیسے لغات نامہ حیات النبیؐ پر حامداللہ ندوی کا مقالہ دکنی مثنوی کے واقعات اور آخر حیات سے زیادہ ادبی لسانی مباحث پر ہے۔ (معارف ۱۵۰/۱: جولائی ۱۹۹۲ء)

محمد ہمایوں عباس شمس کا مقالہ سیرت نبوی کا جغرافیائی اسلوب جدید طرز نگارش کا نمائندہ بتایا گیا ہے۔ (معارف ۱۸۷/۶: جون ۲۰۱۱ء)

لطف الرحمٰن فاروقی کا مقالہ ''رسول رحمت عہد حاضر کے تناظر میں'' اس خیال وفکر کی نمایندگی کرتا ہے کہ سیرت نبوی کو جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق مرتب کرنا چاہیے یا سیرت نبوی سے جدید معاملات ومسائل کو حل کرنے اور امت اسلامی، انسانیت آدمی اور تہذیب وتمدن عالمی کی تعمیر واصلاح اور تہذیب وتشکیل میں کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جیسے حلف الفضول سے انجمن نگرانی حقوق، غزوات نبوی سے اصول جنگ اور قیام امن، سیرت واحادیث سے عالم گیر فساد وعام تاریکی کا ازالہ اور احترام آدمیت وغیرہ کو دو عالمی جنگوں اور عالم گیر فساد وقاتل تہذیب جدید کے تناظر میں ابھارا گیا ہے۔ برصغیر پاک وہند میں بالخصوص اول بقعہ پاک میں اس قسم کے موضوع سیرت نگاری اور تحقیق کے لیے بہت پرکشش ہیں لیکن ان کے دوراز کار مطالب اخذ کیے جاتے ہیں۔ (معارف ۱۸۷/۱: جنوری ۱۹۵۲ء)

سیرت نگاری میں مسلم امت کی خدمات صاحب عالم اعظمی ندوی کا مقالہ مراکش میں منعقد ایک اہم سیرت سیمینار کی روداد پر مشتمل ہے اور عہد جدید میں عرب اہل قلم کی کتب سیرت ومقالات وغیرہ کی فہرست سازی کرتا ہے اور اس سے جدید سیرتی ادب کی نگارش ومعیار کا پتہ چلتا ہے اور نئے اسالیب عصری کا بھی علم ہوتا ہے۔ (معارف ۱۹۱/۱: جنوری ۲۰۱۳ء)

**شبلیات وسلیمانیات:** فکر شبلی وسلیمان کا ترجمان ذیشان ہونے کے سبب معارف دارالمصنّفین فطری اور جذباتی طور سے اپنے اوراق سیرت کو شبلیات وسلیمانیات سے سجانے سنوارنے کا استحقاق بھی رکھتا ہے اور علمی وتصنیفی روایات کا افادہ بھی کرتا ہے۔ رفقائے دارالمصنّفین، مدیران معارف اور وابستگان وامن امامین نے علامہ شبلی وسلیمان کی مصنفہ مولفہ سیرۃ النبی کی اولین دو تین جلدوں کے علاوہ دوسری جلدوں پر بھی مقالات ومضامین چھاپے۔ ان میں سے سیرت نبویؐ سے فنی طور پر متعلق صرف اولین دو جلدیں ہیں یا سید موصوف کی تیسری جلد کی حد تک اور ان کے شہرہ آفاق خطبات سیرت مدراس اور عام قاری وطلبہ کے لیے مختصر رحمت عالم یا ان کے بعض اجزاء جیسے مقدمہ سیرۃ النبی پر بھی بعض مقالات بھی شائع کیے گیے۔ سلیمانیات میں سید صاحب اور دوسرے رفقائے دارالمصنّفین کے وہ مختصر مقالے بھی شامل کیے جاسکتے ہیں جو سیرۃ النبی وغیرہ کے بعض مباحث ومعلومات پر نقد واستدراک ناقدین یا استفسارات کرنے والے قارئین کے جواب میں لکھے گئے۔ ان کا ذکر وشمار بعض دوسرے انواع واقسام کے تحت آیا ہے لیکن وہ ہیں اسی نوع مدافعانہ وقسم مداحانہ کے۔ ان میں سے بعض بعض

میں استاذ اول سے جامع ندوی کا اختلاف مہذب اور نقد شریف بھی ملتا ہے اور صحیح یا زیادہ قابل اعتبار روایت سیرت کی پاسداری کا نادر جوہر بھی۔

پہلے حضرت سید کے استدراکات وجوابات بر نقد ناقدین کے باب میں سیرۃ النبیؐ جلد چہارم پر مولانا اسلم جیراجپوری کے مباحث عالم مثال و عالم برزخ پر نقد و اختلاف کا معاملہ آتا ہے۔ جو دو قسطوں میں چھپا۔ وہ فن سیرت نگاری کے ضمن میں نہیں آتا کہ جلد چہارم کا تعلق اسلام کے عقائد و ارکان سے ہے اور اس کے ساتھ وہ تمام مقالات و جوابات بھی خارج از بحث ہیں جو دوسروں نے سید صاحب کی حمایت اور اسلم جیراجپوری کے نقد میں لکھے ہیں جیسے محمد طٰہٰ اشرف امتھوی، ثناء اللہ امرتسری اور محمد بن یوسف سورتی کے مقالات۔ سید مناظر احسن گیلانی کا طویل مقالہ سیرۃ النبی جلد ششم سے بحث کرتا ہے اور وہ بھی سیرت نبوی سے غیر متعلق ہے کہ اس جلد کا تعلق فضائل ورذائل اخلاق سے ہے۔ (معارف ۱۳/ ۴: اپریل ۱۹۲۴ء/ ۳۳/ ۵۔۶: مئی۔جون ۱۹۳۴ء؛ بالترتیب اور معارف ۴۵/ ۱۔۵: جنوری ۱۹۴۰ء مئی ۱۹۴۰ء)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے دو مقالات سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر ایک نظر (تین طویل قسطوں میں) اور اس جلد پر اعتراضات اور ان کے جوابات کے لیے وقف ہے۔ وہ مدافعانہ اظہار اور پیشکش ہے اور سید صاحب کے بعض منفرد افکار کی توجیہ و تاویل کی کوشش، اس کے بعض مباحث خاص کر اولین حصے جو معجزات کے فلسفیانہ تاویلات و تشریحات سے وابستہ ہیں اسی طرح غیر متعلق ہیں۔ البتہ بعد کے مباحث معجزات میں سید صاحب نے تنقیدی و تحلیلی طور پر بہت سے مشہور عام دلائل و معجزات سے بحث کی ہے۔ ان کو روایتی علماء اور سیرت نگار قابل قبول نہیں کرتے۔ ان کے دفاع میں جو مباحث آئے ہیں وہ سیرت نبوی کا اک کلامی اور استدلالی مبحث ہے۔ (معارف ۱۳۷/ ۵۔۶: مئی جون ۱۹۸۶ء، ۱۳۸/ ۱: جولائی ۱۹۸۶ء نیز ۱۳۸/ ۲: اگست ۱۹۸۶ء)

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم کے قرآنی مباحث پر ضیاء الدین اصلاحی کا مضمون اور سیرۃ النبی کی تکمیل اور رجوع کیے ہوئے مسائل پر ریاست علی کا دفاع بھی اسی طرح فن سیرت نگاری سے دور ہیں۔ (معارف ۱۶۰/ ۵۔۶: نومبر و دسمبر ۱۹۹۷ء)۔

سیرت النبیؐ جلد ہفتم پر سید مولف کے دو مقالات اصلاً اسی کے دو ابواب ہیں جن میں

حکومت الٰہیہ اور حاکم اعلیٰ سے زیادہ بحث ہے اور اس طرح موضوع پر منیر الدین کا مکتوب بھی غیر متعلق ہے۔ (معارف ۱۲۱/ ۳: مارچ ۱۹۷۸ء)

عبداللہ عباس ندوی کا سیرۃ النبی جلد ہفتم کا مطالعہ صرف تحسین و تعریف مبالغہ آمیز کا آئینہ دار ہے اور سیرت نگاری سے موضوع مقالہ کی مانند کوئی تعلق نہیں۔ (معارف ۱۶۷/۲: فروری ۲۰۰۱ء)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے دو مقالات سیرۃ النبی میں مولانا سید سلیمان ندوی انشا پرداز کی حیثیت سے اور خطبات مدراس دونوں کے دونوں مباحث کتب اور ان کی تعریف و تحسین کے لیے وقف ہیں۔ اول الذکر میں متعدد انشا پردازانہ کمالات و اوصاف کا ذکر ہے اور دوم میں کتاب خطبات کے امتیازات پر مدح سرائی کی گئی ہے۔ (معارف ۱۳۵/۲: فروری ۱۹۸۵ء/ ۱۳۷/۲: فروری ۱۹۸۶ء)

ان تمام مقالات و مباحث میں کسی جگہ نقد و تجزیہ اور تحقیق و تحلیل کی اصولی پاسداری نہیں کی گئی۔ بلاشبہ سیرۃ النبی، خطبات مدراس سیرت نگاری جدید کی عظیم ترین مثالیں ہیں لیکن ان میں تسامحات و اغلاط شبلی و سلیمان موجود ہیں۔ حضرت جامع نے دونوں جلدوں میں اپنے استاذ گرامی کی بعض روایات کے اخذ و قبول اور تشریحات اور تجزیوں پر نقد کیا ہے جو آداب نقد و مصنف کو ہی نہیں بتاتا بلکہ صحیح روایت و سیرت نگاری کی مثال بھی ہے اور اسے کمال تہذیب و تحقیق بھی کہہ سکتے ہیں۔ سید صاحب نے اسی طرح شبلی کے رسالہ اولین بدء الاسلام میں جناب عبداللہ کی وفات اور تاریخ ولادتِ نبویؐ پر صحیح روایت کو اپنے استاذ کی نقل کردہ روایت پر ترجیح دے کر اصول نقد و تہذیب قائم کیا ہے لیکن مدلل مداحین کے نزدیک شبلی و سلیمان نقد و تبصرہ سے ماورا تھے جیسا کہ ان کے جانشینوں کا وطیرہ ہے۔ اسی کی ایک مثال محمد عارف عمری کا مقالہ بعنوان مولانا شبلی کی ایک عدیم المثال اور مہتم بالشان تصنیف سیرۃ النبی، محمد الیاس اعظمی کا مقالہ علامہ شبلی کی سیرۃ النبی اور مقدمہ سیرۃ النبی پر مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے مقالات ہیں۔ سیرۃ النبی شبلی میں وارد مستشرقین کا تعارف از صاحب عالم اعظمی اور سیرۃ النبی کا ایک گمنام مترجم دونوں کتاب سیرت سے زیادہ مستشرقین اور حیات مترجم سے تعرض کرتے ہیں۔ شبلیات و سلیمانیات میں تعریف و تحسین امتیازات و خصائص کے ساتھ نقد و استدراک تسامحات و نقائص بھی لازمی ہیں۔

(معارف، ۱۴۲-۱۴۳/۶: دسمبر ۱۹۸۸ء، جنوری ۱۹۸۹ء/ ۱۵۶/۴-۵: اکتوبر-نومبر ۱۹۹۵ء/ ۱۶۱/۲-۳: فروری-مارچ ۱۹۴۸-۴/۴: اکتوبر ۲۰۰۹ء/ ۲۰۱۱-۱۴ اگست اکتوبر ۲۰۱۱ء، ۱۷۵/۱: جنوری ۲۰۰۵ء)۔ (باقی)

# علامہ شبلی کی چند غیر مدون تحریریں

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

علامہ شبلی (۱۸۵۷۔ ۱۹۱۴ء) کی نادر تحریروں کے مجموعہ "نوادرات شبلی" کی ۲۰۱۷ء میں اشاعت کے وقت خیال تھا کہ اب کوئی تحریر شاید ہی ملے، مگر یہ خیال خام ثابت ہوا اور بہت جلد چند اہم، نادر اور غیر مدون تحریریں قدیم کتب و رسائل سے دستیاب ہوگئیں اور کئی اور تحریروں کا سراغ بھی لگا، مثلاً:

۱۔ عہد سرسید میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ میں جو بک ڈپو قائم ہوا تھا جسے ڈیوٹی شاپ بھی کہتے تھے، اس کے ایک ذمہ دار ایم۔ اے۔ او اسکول کے استاد اور علامہ شبلی کے دوست میر ولایت حسین (۱۸۶۲۔۱۹۴۹ء) تھے۔ انھوں نے اپنے عہد میں ڈیوٹی شاپ کی ایک "مختصر فہرست کتب" شائع کی تھی جس میں سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی وغیرہ کی کتابوں کی تفصیلات درج تھیں، میر ولایت حسین نے اس فہرست کا مقدمہ علامہ شبلی سے لکھوایا تھا (۱)۔ یہ فہرست مولانا آزاد لائبریری کے عبدالسلام کلکشن (اردو) میں محفوظ تھی، جو تلاش بسیار بلکہ تمام تر کوششوں کے باوجود اب تک دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ چونکہ اس میں سرسید، حالی، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کی کتابوں کا ذکر ہے، اس لیے خیال ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ان شخصیات کی کتابوں کے بارے میں ضرور اظہار خیال کیا ہوگا۔

۲۔ ہمارے کرم فرما ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب ڈائرکٹر رام پور رضا لائبریری کی اطلاع کے مطابق مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی نے صمصام الاسلام کے نام سے فتوح الشام واقدی کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا، جو ۱۹۱۴ء میں آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کی تقریظ بھی علامہ شبلی کے قلم سے ہے، لیکن یہ منظوم ترجمہ اب تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے، اسی نام سے فتوح الشام کا منظوم اردو ترجمہ

---

رفیق اعزازی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ۔ Email:azmi408@gmail.com (Mob:+919838573645)

سید عبدالرزاق کلامی نے بھی کیا ہے۔ جو مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اسے راقم الحروف نے دیکھا ہے۔ اس میں کئی تقریظات شامل ہیں، لیکن علامہ شبلی نعمانی کی تقریظ شامل نہیں ہے، البتہ اس میں مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۴ـ۱۹۳۰ء) کے استاد مولوی محمد مہدی چتاروی (چتارہ ـ اعظم گڑھ) کی منظوم اردو تقریظ شامل ہے (۲)۔ مولوی محمد مہدی چتاروی اعظم گڑھ کے قدیم علماء میں ہیں، اس منظوم تقریظ سے ان کی شاعری کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

یقین ہے صمصام الاسلام کی تقریظ شبلی ایک نہ ایک دن ضرور دستیاب ہوگی، اس لیے کہ اس کی اطلاع ایک محقق ڈاکٹر سید حسن عباس نے ایک بڑے محقق امتیاز علی خاں عرشی (۱۹۰۴ـ۱۹۸۱ء) کے حوالہ سے فراہم کی ہے۔

آثار شبلی (مطبوعہ ۲۰۱۳ء) کے آخری باب میں جن نادر تحریروں کی نشاندہی راقم الحروف نے کی تھی، اس میں مذکور بیشتر تحریریں ''نوادرات شبلی'' میں شامل ہو چکی ہیں، البتہ درج ذیل غیر مطبوعہ تحریروں کی اب بھی تلاش ہے۔

۳ـ چند خطوط جو نواب جنجیرہ کے ذخیرہ میں محفوظ ہیں اور جنجیرہ کی ایک نمائش میں رکھے گئے تھے، اس کی اطلاع ہمارے دوست مولانا عبدالبرا اثری نے دی تھی۔

۴ـ علامہ شبلی کے دوست اور حیدرآباد کے مشہور قانون داں سید ہمایوں مرزا (۱۸۷۰ـ۱۹۳۸ء) کی اہلیہ بیگم صغرا ہمایوں مرزا (۱۸۸۴ـ۱۹۷۴ء) بڑی ذی علم خاتون تھیں، انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''مشیر نسواں'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس مطبوعہ کتاب پر بھی علامہ شبلی نے تقریظ لکھی تھی جو ۷/مارچ ۱۹۱۳ء کی مرقومہ ہے۔ یہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے ذخیرہ میں محفوظ تھی۔ (۳)

۵ـ اسی طرح ''تاریخ کوسگی'' مولفہ مولوی سید عبداللہ حسینی پر علامہ شبلی کی ۱۹۰۶ء کی لکھی ہوئی غیر مطبوعہ تقریظ بھی ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ تھی۔ مذکورہ بالا دونوں تقاریظ کا ذکر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ (۴)

۶ـ ایک اطلاع کے مطابق علامہ شبلی کے اکلوتے فرزند حامد حسن نعمانی (۱۸۸۰ـ۱۹۴۲ء) کے نام علامہ شبلی کے چند خطوط ان کی صاحبزادی آمنہ سہیل کے پاس محفوظ ہیں۔ ان کی دستیابی سے

علامہ شبلی کی ذاتی زندگی کے کئی پہلو سامنے آسکتے ہیں۔ راقم الحروف ان تحریروں کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔

یہ عدم دستیاب تحریروں کی تفصیل ہے، البتہ گذشتہ دنوں مطالعہ کے دوران علامہ شبلی کی درج ذیل غیر مدون اور نادر تحریریں دستیاب ہوئی ہیں:

ا۔ اردو کے ممتاز اور کہنہ مشق شاعر جناب ناوک حمزہ پوری کے والد سید غلام رسول قوس حمزہ پوری (۱۸۸۵۔ ۱۹۶۳ء) بڑے عالم، فاضل، ادیب، شاعر اور اہل قلم تھے۔ مدۃ العمر دادِ سخن دیتے رہے۔ ان کی شاعری کے مداح حالی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے قرینہ غزل اور قوس قزح ان کے صاحبزادے ناوک حمزہ پوری نے مع ترجمہ مرتب کر کے شائع کر دیے ہیں۔ ایک کتاب ''جلوہ گاہ پیغمبر'' بھی ان کی یادگار ہے۔ کئی کتابیں اور مجموعہ کلام غیر مطبوعہ ہیں اور بعض ضائع ہو گئے۔ (۵)

علامہ شبلی ۱۹۰۴ء میں دستار بندی کے موقع پر مولوی عبدالحق حقانی کے ساتھ ضلع گیا بہار تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع پر قوس حمزہ پوری کی ان سے پہلی ملاقات ہوئی، پھر وہ ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ملاقات کے لیے لکھنؤ پہنچ گئے۔ ان دنوں علامہ شبلی ندوہ کے معتمد تعلیم تھے اور ان کا قیام امین آباد میں تھا۔ لکھنؤ میں ان کی ملاقات حکیم عبدالعزیز (۱۲۷۱۔ ۱۳۲۹ھ) کے دولت کدے پر ایک تقریب میں ہوئی، دوسرے دن وہ علامہ شبلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس ملاقات کی تفصیل ناوک حمزہ پوری کے قلم سے ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت علامہ نے قوس سے ان کی چند غزلیں سنیں، ۲۵۔۲۶ر سال کے نوجوان سے حضرت علامہ کو غالباً فارسی میں پختہ کلامی کی توقع نہیں رہی ہوگی۔ اس لیے قوس کا کلام سن کر انہیں یک گونہ تعجب ہوا۔ حضرت علامہ نے امتحاناً اپنی ایک غزل کا مطلع قوس کو دیا اور اس زمین میں ایک مطلع کہنے کی فرمائش کی:
>
> اے کہ گفتی رہ و رسم تو نہ ایں می باید
>
> ما ہمی نیم کہ ہستیم و ہمیں می باید
>
> حضرت قوس نے محض تین چار منٹوں کے غور و فکر کے بعد یہ شگفتہ مطلع

کہہ کر پیش کیا:

جام مے در کف و در بربت چیں می باید
بندہ عشقم و دنیا و نہ دیں می باید

بقول حضرت قوس علامہ موصوف شعر سن کر پھڑک اٹھے، نہایت مسرور ہوئے۔ بار بار شعر کو پڑھتے تھے اور کلام کی فصاحت و بے ساختگی کی داد دیتے تھے۔ اس کے بعد قوس کو اپنی شاگردی کا شرف بخشا۔ دیوان قوس کو بغرض اصلاح رکھ لیا اور دو ماہ بعد حضرت قوس کے قیام لکھنؤ کے درمیان کلام قوس کی نوک پلک درست کردی۔ دوران قیام جو تازہ کلام قوس نے کہا اسے بھی دکھاتے رہے۔ ان دنوں علامہ کا دستور یہ تھا کہ دس بجے شب کے بعد منتہی تلامذہ (ندوہ) کو بصورت سوال و جواب یا کبھی بہ شکل لکچر درس دیا کرتے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر حضرت قوس بھی اکثر اس جماعت میں شامل ہوجایا کرتے تھے اور بقول خود اس مختصر مدت میں بھی بے حد فیض اٹھایا''۔(۶)

دو ماہ قیام کے بعد قوس حمزہ پوری وطن حمزہ پور واپس آ گئے، تاہم دونوں میں مراسلت کا سلسلہ قائم رہا۔ ناوک حمزہ پوری نے اپنی کتاب ''قوس حمزہ پوری: ایک تعارف'' میں علامہ شبلی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے جو ان کے پاس محفوظ ہے۔ یہ خط مکاتیب شبلی کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

''عزیزی مولوی قوس سلمہ:

زندہ باشی و جاوداں باشی

حکیم عبدالعزیز مرحوم حج سے واپس آ کر کم و بیش سال بھر زندہ رہ کر واصل الی اللہ ہوئے۔ میں ان کے فاتحہ چہلم اور مجلس مولود شریف میں شریک ہوا تھا۔ ان کے بھائی حکیم عبدالحفیظ صاحب سے اگر رجوع کرنا چاہو تو لکھنؤ آ سکتے ہو۔ مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی کے خطوط سے معلوم ہوا کہ دونوں صاحبوں نے تمہارے پاس کلیات قوس سے متعلق اپنی بیش بہا رائیں بھیج دی ہیں۔ کلیات سے عربی قصائد

نکال ڈالو، جب ان کا اسلوب بیان بھی شعرائے عرب کے مطابق نہیں تو محض عربی کی عبارت سے کیا فائدہ؟ خدا تمہارے کلام کو حسن قبول بخشے۔ یہ کلام پند و نصائح کا خزینہ اور قومی خط و خال کا آئینہ ہے۔ غزلیات کی بندشیں کچھ سست ہیں لیکن اور اصناف سخن ادب کی جان اور اخلاقی تعلیم کی زندہ تصویریں ہیں۔

دعا ہے کہ خدا تمہارے گلشن تخیل کو غالب کی جنت نظر اور فردوس گوش بنائے۔ آمین

شبلی

۷؍نومبر ۱۹۱۲ء (۷)

۲۔ اردو کے نامور ادیب نوبت رائے نظر (۱۸۶۶۔ ۱۹۲۳ء) اور ان کے مشہور رسالہ ادیب الٰہ آباد سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں۔ ادیب کی بڑی خدمات ہیں، اس کے مشمولات پر علامہ شبلی نے نوبت رائے کو ایک خط لکھا تھا، چونکہ یہ خط علم و ادب کی ترقی سے متعلق تھا، اس لیے انہوں نے اس کا ایک اقتباس ادیب میں نقل کیا تھا، جو درج ذیل ہے:

''ادیب کے حسن ظاہری میں کیا شک اور حسن معنوی میں بھی اردو کے کسی رسالہ سے کم نہیں۔ یا یوں کہیے کہ کوئی رسالہ اس سے بڑھ کر نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب ایک محدود دائرہ سے قدم آگے بڑھانا چاہیے، اب تک جو کچھ ہو رہا ہے یا اپنی داستانیں ہیں یا یورپ کی نہایت سرسری معلومات۔ اس سے زبان کی ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھتا، کوشش کی جائے کہ ہربرٹ اسپنسر اور ہکسلے وغیرہ کا فلسفہ اردو زبان میں آئے۔ انگریزی سے اردو میں جو کچھ منتقل ہو رہا ہے او چھے اور ادنیٰ درجہ کے معلومات ہیں، ان کو کہاں تک بار بار پڑھیے۔ یوروپین معلومات کے لحاظ سے آج سے دس برس پہلے ہم لوگ جہاں تھے اب بھی وہیں ہیں''۔ (۸)

ان دونوں خطوط کے ملنے سے مکاتیب شبلی کی تعداد ۱۱۱۹ ہوگئی ہے۔

۳۔ اردو فارسی کے ممتاز اور قادرالکلام شاعر سید رضا علی وحشت (۱۸۸۱۔۱۹۵۶ء) علامہ شبلی کے بڑے قدردانوں میں تھے۔ ان پر انگریزی میں مضمون لکھا جو ۱۹۰۹ء میں کلکتہ کے اخبار مارننگ نیوز میں شائع ہوا۔ ایک بار مسلم انسٹی ٹیوٹ گزٹ کلکتہ کے جلسہ میں ان کی دعوت پر علامہ شبلی شریک

ہوئے۔اس موقع پر انہوں نے فارسی میں استقبالیہ نظم پڑھی جس کے ہر شعر سے ان کی عقیدت شبلی کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی رہی مگر کوئی خط دستیاب نہیں ہے۔ وحشت کا پہلا دیوان شائع ہوا اور انہوں نے علامہ شبلی کی خدمت میں بھیجا تو انہوں نے لکھا کہ:

"آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرز آپ سے خوب بن پڑتی ہیں"۔(۹)

۴۔۱۹۰۵ء سے کچھ پہلے جامع مسجد اعظم گڑھ میں حنفیوں اور اہل حدیثوں کے درمیان آمین بالجہر اور بالخفا کے تنازع کے پس منظر میں ایک اہل حدیث عالم شیخ قادر بخش نے مولانا خدابخش سے ایک استفتاء تیار کرایا اور اسے مولوی محمد یعقوب الہٰ آبادی امام جامع مسجد اعظم گڑھ اور علامہ شبلی کی خدمت میں پیش کیا اور فتویٰ مانگا۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے جو فتاوے دیے انہیں اپنی ایک تحریر کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں سعید المطابع بنارس سے طبع کرا کے جامع مسجد اعظم گڑھ کے مصلیوں میں تقسیم کیا تھا (۱۰)۔چونکہ یہ علامہ شبلی کا واحد دریافت فتویٰ ہے اور اس سے اہل حدیث مسلک کے بارے میں ان کی عہد شباب کی شدت میں واضح کمی محسوس ہوتی ہے۔اس لیے استفتاء کے ساتھ اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔شیخ قادر بخش کا استفتاء یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

**ما قولھم رحمہ اللہ تعالی**۔ایک شخص اپنے کو امام ابوحنیفہؒ کا مقلد کہتا ہے اور مسائل اجتہادیہ میں جناب امام صاحب کا حکم تسلیم کرتا ہے اور نماز میں رفع یدین و آمین بالجہر بنظر اتباع سنت رسول مقبولؐ کے کرتا ہے،اس کو منع کیا جاتا ہے کہ تم اس مسجد میں جس میں ہم لوگ آمین بالخفا کرتے ہیں، رفع یدین و آمین بالجہر نہ کہا کرو۔ہم لوگوں کی نماز خراب ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ میں اتباع رسول اللہؐ کی سنت جان کر کرتا ہوں، نہ بہ نیت لہو و لعب کے۔یہ فعل اس کا حدیث صحیح سے ثابت ہے یا نہیں۔اگر ثابت ہے تو ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز ہوتی ہے یا نہیں۔آمین بالجہر کہنے والا جماعت میں شریک ہو کر آمین بالجہر کہے تو اس کے کہنے سے آمین بالخفا کہنے

والے کی نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں اور اگر اس شخص کو اپنی جماعت میں نماز نہ پڑھنے دینا کیسا ہے اور جو لوگ اس کو مسجد و جماعت سے منع و باز رکھتے ہیں، مستحق ثواب ہیں یا عذاب؟

اس کا جواب للہ حق، بلا تعصب و جانبداری کے بصراحت ارقام فرمایے۔

فقط شیخ قادر بخش

جواب:

آمین جو شخص بجہر کہتا ہے اس کے پیچھے نماز یقیناً درست ہے۔ نماز تو فاسق کے پیچھے بھی درست ہے اور آمین بجہر کہنے والا تو فاسق بھی نہیں ہے اور جماعت سے ایسے شخص کو الگ نہ کرنا چاہیے اور اس شخص کے آمین بجہر کہنے سے دوسروں کی نماز میں کچھ اثر نہیں پڑتا اور جماعت سے ایسے شخص کو خارج کرنا گناہ ہے۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو کہ یہ شخص بنظر تفریق جماعت و فساد انگیزی کے یہ فعل کرتا ہے تو اس کا خارج کرنا جماعت سے روا ہے اور حدیث میں آمین آہستہ و زور سے کہنا دونوں پر آیا ہے۔ واللہ الموفق۔ محمد شبلی نعمانی بندولی (۱۱)

۵۔ ۴؍جنوری ۱۹۰۳ء کو ایجوکیشنل کانفرنس نے انجمن ترقی اردو کا شعبہ قائم کیا، علامہ شبلی نعمانی اس کے سکریٹری نامزد ہوئے، اس وقت اگرچہ علامہ شبلی ناظم سررشتہ علوم و فنون حیدرآباد کے عہدہ پر فائز تھے۔ تاہم انتہائی انہماک اور دلچسپی سے ترقی اردو کے لئے سرگرم ہوئے اور متعدد علمی منصوبے بنائے اور سب سے پہلے دستور العمل تیار کیا اور طبع کرا کے اہل ذوق بالخصوص ایجوکیشنل کانفرنس کے اراکین کے پاس ملاحظہ کے لیے بھیجا، یہ دستور العمل تلاش بسیار کے باوجود اب تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ دستور العمل تیار کرنے کے بعد اہل علم اور ارباب کمال کا انجمن سے رشتہ قائم کیا، ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶۔ ۱۹۱۲ء)، ذکاء اللہ دہلوی (۱۸۳۲۔ ۱۹۱۰ء) اور مولانا حالی (۱۸۳۷۔ ۱۹۱۴ء) تو نائب صدر انجمن کی حیثیت سے وابستہ تھے ہی علامہ شبلی نے علامہ اقبال (۱۸۷۷۔ ۱۹۳۸ء)، مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸۔ ۱۹۵۸ء) اور مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳۔ ۱۹۵۶ء) وغیرہ متعدد جوہر قابل کو انجمن سے وابستہ کیا۔ مولانا آزاد اس وقت کلکتہ سے لسان الصدق نکال رہے تھے۔

لسان الصدق کو علامہ شبلی نے انجمن کا ترجمان قرار دے دیا اور لکھا کہ:

''مولوی ابوالکلام صاحب کی شرکت سے بنگال میں انجمن کی اشاعت کی قوی امید ہے کیونکہ آپ نہایت ہمدردی سے انجمن کی اعانت فرمار ہے ہیں اور ہر کام میں ہمدردی سے حصہ لیتے ہیں''۔(۱۲)

اسی طرح انہوں نے علامہ اقبال کو بھی علمی کمیٹی کا رکن بنایا گیا، چنانچہ تراجم کتب کے انتخاب میں ان کی آرا بھی شامل تھیں۔تراجم کے جانچنے والوں میں بھی ان کا نام شامل تھا، انجمن ترقی اردو کی بعض کتابیں ان ہی کی رائے سے ترجمہ ہوکر شائع ہوئی ہیں۔

اخبار ہندوستانی میں بعض ہندو اہل قلم کی طرف سے انجمن پر یہ اعتراض کیا گیا کہ انجمن نے ہندوؤں کو نظر انداز کیا ہے اور انہیں خاطر خواہ نمائندگی نہیں دی گئی ہے تو علامہ شبلی نے سکریٹری کی حیثیت سے اس اعتراض کا یہ جواب لکھا کہ:

''یہ واقعہ کے خلاف ہے۔انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو تصنیف پر دیا ہے وہ ایک ہندو مترجم کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی یعنی کتاب ''پیغمبران ہند'' جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول وعقائد ہیں''۔(۱۳)

یہ اصل تحریر کا ایک اقتباس ہے۔اصل تحریر اخبار ہندوستانی میں شائع ہوئی تھی، جواب تک دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔بہرحال اس تحریر کی اشاعت کے بعد ہندو ادیب اور اہل قلم متوجہ ہوئے اور انجمن کے رکن بنے اور تعاون کیا۔

۶۔علامہ شبلی نے انجمن کی طرف سے جن کتابوں اور ترجموں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا اس میں سے چند کتابیں ہی ان کے عہد نظامت میں شائع ہوسکیں، اس میں ایک ''رہنمایان ہند'' بھی ہے، اس کے مترجم نارائن پرشاد ورما ہیں۔یہ ۱۹۰۴ء میں انجمن کی طرف سے شائع ہوئی۔اس کے آخری صفحہ پر ''انجمن ترقی اردو'' کے عنوان سے دفعہ وار اس کا دستور درج ہے۔چونکہ انجمن کا دستور علامہ شبلی نے تیار کیا تھا، اس لیے قیاس ہے کہ یہ دستور بھی علامہ شبلی ہی کا تحریر کردہ ہے۔اسلوب نگارش

کے لحاظ سے بھی یہ علامہ ہی کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ یہ دستورالعمل حسب ذیل ہے:

دفعہ۔۱: اس انجمن کا مقصد اردو زبان کو علمی حیثیت سے ترقی دینا ہے۔

دفعہ۔۲: جو صاحب انجمن کی تیار کردہ کتابیں سال میں پانچ روپیہ قیمت تک کی خریدنا منظور کریں انجمن کے رکن اعانت قرار پائیں گے۔

دفعہ۔۳: جن بزرگوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے اردو پر احسان کیا ہے یا وہ بزرگ جو انجمن کو معتدبہ مالی مدد دیں، یا کسی اور طریقہ سے انجمن کو معتدبہ فائدہ پہنچائیں، انجمن کے رکن اعزازی قرار پائیں گے۔

دفعہ۔۴: انجمن وقتاً فوقتاً ان عربی اور انگریزی کتابوں کی فہرست شائع کرے گی جو اردو میں ترجمہ کیے جانے کے قابل ہیں۔ اسی طرح ان مضامین کو متعین کرے گی جن پر تصنیف و تالیف کی ضرورت ہے۔ ان تصنیفات اور تراجم پر انجمن کی طرف سے معتدبہ صلہ مقرر کیا جائے گا، اس کے ساتھ مصنّفین کو تصنیف کے متعلق ہر قسم کی ہدایت اور اطلاعات سے مدد دی جائے گی۔

دفعہ۔۵: انجمن وقتاً فوقتاً اردو کی اعلیٰ درجہ کی تصنیفات کی فہرست شائع کرے گی تا کہ ملک میں عمدہ تصنیفات کا رواج ہو۔ (۱۴)

مذکورہ دفعات کے مطابق انجمن نے متعدد کام انجام دیے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آخری دفعہ کے مطابق علامہ شبلی نے مولوی سجاد مرزا بیگ دہلوی (۱۸۷۶۔ ۱۹۲۷ء) سے فہرست کتب مرتب کرنے کی خواہش کی تھی (۱۵)۔ چنانچہ انہوں نے انتہائی محنت سے یہ فہرست تیار کی جو علامہ شبلی کی وفات کے بعد ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد سے ''الفہرست'' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ اردو میں پہلا اشاریہ کتب ہے جو علامہ شبلی کے ایما پر تیار کیا گیا۔

۷۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲۔۱۹۷۷ء) کو علامہ شبلی سے خصوصی تعلق تھا اور وہ لکھنؤ میں علامہ شبلی کی مجلس کے خاص حاضر باشوں میں تھے اور انہیں اپنا معنوی استاد خیال کرتے تھے، انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی۔ ۱۹۱۴ء میں کیننگ کالج میں فلسفہ کے استاد کی عارضی طور پر ایک جگہ خالی ہوئی تو اس جگہ پر تقرر کے لیے مولانا عبدالماجد دریابادی نے کوشش کی، اس سلسلہ میں انہوں نے علامہ شبلی سے بھی سفارشی خط لکھوایا تھا۔ جسے انہوں نے اپنی کتاب ''خطوط مشاہیر'' کے

ایک حاشیہ میں نقل کیا ہے، علامہ شبلی ان کے عہد شباب کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے اور ان کے مستقبل کے لیے کس قدر فکرمند تھے، ان کی اس تحریر سے واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے کو میں ایک مدت سے جانتا ہوں۔ ان کے علمی خصوصاً فلسفیانہ مضامین میں نے کثرت سے پڑھے ہیں۔ مجھ کو جہاں تک معلوم ہے کہ ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو نہایت دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس خوبی سے ادا کر سکتا ہو جس طرح عموماً مولوی عبدالماجد صاحب کے مضامین میں پائے جاتے ہیں۔

میں انگریزی نہیں جانتا، لیکن مصر و شام میں یورپ کا فلسفہ جس قدر عربی میں منتقل ہوا ہے سب میرے پیش نظر ہے۔ میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ کسی عربی ترجمہ یا مستقل تصنیف میں بھی فلسفیانہ مسائل اس خوبی سے ادا نہیں کیے گئے ہیں۔

مولوی صاحب موصوف بالطبع فلاسفر ہیں، ان کا ذوق خالص علمی ذوق ہے۔ وہ ہمہ وقت فلسفہ اور متعلقات فلسفہ کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں اور یہ بالکل قطعی ہے کہ گو وہ فلسفہ میں ایم۔ اے نہیں ہیں لیکن کثیر التعداد ایم۔ اے سے بہتر ہیں، اگر وہ فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوں تو میں کالج کی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

ان اوصاف کے علاوہ ان کے ذاتی اخلاق و عادات، متانت، سنجیدگی اور شرافت نسب کی بہتر سے بہتر شہادت دے سکتا ہوں۔

شبلی

۵/ اپریل ۱۹۱۴ء (۱۶)"

۸۔ شمس العلما خان بہادر نواب عزیز جنگ ولا (۱۸۶۰۔ ۱۹۲۴ء) تعلقہ دار حیدرآباد بڑے باکمال شخص تھے۔ مختلف علوم و فنون پر ان کی نظر تھی، شعر و ادب کے بڑے ادا شناس تھے۔ مدۃ العمر اردو و فارسی میں داد سخن دیتے رہے۔ کلیات نظم ولا اور دیوان ولا وغیرہ ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ سلیمان اریب نے ان کی پچیس کتابوں کا ذکر کیا ہے جو تاریخ و سیر، لغت، قوانین، کاشت کاری، مصطلحات دکن وغیرہ موضوعات پر ہیں (۱۷)۔ ان سے ولا کی مختلف علوم پر عالمانہ درک و

بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ولا نے علم وفن اور شعر وادب کے ساتھ عوامی خدمات بھی انجام دیں۔ حیدرآباد سے ایک اخبار عزیز الاخبار اور ایک رسالہ لسان الہند والعجم بھی جاری کیا۔ ایک پریس بھی عزیز المطابع کے نام سے قائم کیا تھا۔ غرض ولا اپنے عہد کے متحرک اور فعال شخص تھے۔

حالی و شبلی سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ان کی متعدد تصنیفات پر دونوں بزرگوں کے قلم سے تقریظات شامل ہیں۔ علامہ شبلی نے ان کی مشہور کتاب تاریخ النوایط پر تقریظ لکھی ہے جس کا ذکر گزشتہ سال معارف میں آچکا ہے۔ حال میں ایک فاسی کتاب یادگار رولا پڑھتے ہوئے علامہ شبلی کی ایک اور تقریظ نظر سے گذری جو ولا کی کتاب سیاق دکن پر لکھی گئی ہے۔ سیاق دکن میں بقول مصنف ''سیاق عرب وعجم ودکن کی تاریخ اور اعمال سیاق واصطلاحات کی تعریف اور ترتیب حسابات اور اس کی تنقیح کا طریقہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے''۔

سیاق دکن میں علامہ شبلی کی تقریظ شامل نہیں ہے بلکہ اسے یادگار رولا کے مصنف برق موسوی نے نقل کیا ہے۔ یہ تقریظ انگریزی میں ہے اور غالباً ترجمہ کرکے شامل کی گئی ہے، اس کے بارے میں برق موسوی نے کسی طرح کی تفصیل نہیں دی ہے۔ غالباً کتاب کے فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے اسے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہی نہیں حالی، محسن الملک، عماد الملک اور سر رچرڈسن وغیرہ کی تقاریظ بھی انگریزی میں ہیں۔ تقریظ شبلی درج ذیل ہے:

When light and superficial books are increasing in number on all sides in the country and even educated men following the trend of public taste seem largely inclined towards such contemptible publications, it is extremely surprising to find a counted few engaged in the pursuit of problems that do not admit of easy solution - a counted few whose publications though they do not serve as stories, add an invaluable capital

to the store of literature.

One of such publications, is that which forms the heading of our review and which is written by our respected friend Nawab Aziz Jung Bahadur. In our researches to get an insight into the ancient modes of procedures, we have turned over hundreds and thousands of pages of history and though we may have pleased the public by superficial embelishment of ordinary facts, yet in all fairness we have to admit that what we have acquired is but fraction of the stupendous whole, and our Nawab deserves to be congratulated for having compiled a book, full of extraodinary researches, covering 166 pages bearing on accounts alone.

The Nawab has found out 417 technicalities relating to accounts, of which a good many were quie unknown to us.

a perusal of this book gives such a perspicous insight into the modes of accounts in vogue during the time of Timur, that it apears as if all kinds of records are before us.

While commenting upon every technicality the Nawab has also discussed its origin, and for this he had to

investigate various languages as these account technicalitises aree an embodiment of several dialects. (18)

---

## حوالے

(۱) آپ بیتی، میر ولایت حسین، ص ۹۱، ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ، ۱۹۷۰ء۔ (۲) خاتمہ منظوم فتوح الشام، سید عبدالرزاق کلامی، ص ۴۳۵، نول کشور لکھنؤ، ۱۹۰۰ء۔ (۳) صبا، "شبلی نمبر"، ص ۷۳، حیدرآباد۔ (۴) ایضاً۔ (۵) قوس حمزہ پوری ایک تعارف، ناوک حمزہ پوری، ص ۲۶۲۔ ۲۷۹، حمزہ پور گیا، ۱۹۸۲۔ (۶) ایضاً، ص ۸۳۔ ۸۴۔ (۷) ایضاً، ص ۸۴۔ ۸۵۔ (۸) ماہنامہ ادیب، ص ۹۷، الہ آباد، اگست ۱۹۱۰ء۔ (۹) حیات وحشت، ڈاکٹر وفا راشدی، ص ۷۴، مکتبہ اشاعت اردو، کراچی، ۱۹۸۲ء۔ (۱۰) چند رجال اہل حدیث، ابوعلی اثری، ص ۳۵۔۳۶، ندوۃ المحدثین، گجرانوالہ، ۱۹۸۶ء۔ (۱۱) ایضاً۔ (۱۲) باقیات شبلی، مشتاق حسین، ص ۸۷، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۴ء۔ (۱۳) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ایڈیٹر نواب محسن الملک، ص ۸، اکتوبر ۱۹۰۳ء۔ (۱۴) رہنمایان ہند، نارائن پرشاد ورما، ص آخر، انجمن ترقی اردو، ۱۹۰۴ء۔ (۱۵) الفہرست، مولوی محمد سجاد مرزا بیگ، ص ۳، نظام رکن پریس، حیدرآباد، ۱۹۲۳ء۔ (۱۶) خطوط مشاہیر، مولانا عبدالماجد دریابادی، ص ۲۷۔۲۸، تاج کمپنی لاہور، ۱۹۴۵ء۔ (۱۷) حیدرآباد کے شاعر حصہ دوم، ص ۱۷، آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی، حیدرآباد، ۱۹۶۲ء۔
(۱۸) یادگار ولا، برق موسوی، ص ۲۹، مکتبہ سعدی، حیدرآباد، ۱۹۴۱ء۔

# علامہ حکمی بنگلوری اور ان کی تصنیف "دستور نامۂ فارسی"

ڈاکٹر راہی فدائی

ہندوستان کے جنوبی و شمالی علاقوں اور اس کے مختلف و مقابل جہتوں کے مزاج و منہاج، آب و ہوا، زبان و تہذیب، عادات و اخلاق اور رسم و رواج میں شدید اختلاف و افتراق کے باوجود ان دو عظیم حصوں میں ایک اہم قدر مشترک اور غیر معمولی جامع وصف بھی ہے، جس کا ادراک و احساس مختلف علمی و تاریخی شہادتوں کے تفحص و تلاش کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ وہ قدرِ مشترک جنوب و شمال میں جا بجا یکساں طور پر علوم و فنون کے سرچشموں کا پایا جانا ہے۔ وہ علمی سرچشمے مدارس کی شکل میں بھی موجود ہیں اور شخصیات کی صورت میں بھی جلوہ افروز ہیں۔ تشنہ گان علوم مذکورہ دونوں منابع سے ہر دور میں سیراب و فیضان ہوتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ بحمداللہ تا حال جاری ہے، انشاءاللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (متوفی ۸۲۵ھ) کے تلمیذ اور جنوبی ہند کی وسیع و عریض بہمنی سلطنت کے وزیر اعظم علامہ خواجہ عمادالدین محمود گاواں شہید (شہادت ۸۸۶ھ مطابق ۱۴۸۱ء) کی بیدر (کرناٹک) میں تعمیر کردہ عظیم جامعہ دینیہ (قائم شدہ ۸۷۶ھ) (۱) کے فیض یافتہ علماء و فضلا کی نسلیں آج بھی سرزمین جنوب میں پھیلی ہوئی اشاعت دین میں مصروف ہیں۔ مثلاً خانوادۂ شہمیریہ کڈپہ (آندھرا پردیش) دودمان قاضی بدرالدولہ مدراس (ٹمل ناڈو) کے آبا و اجداد مدرسہ خواجہ محمود گاواں کے بارہویں صدی کے استاذ امام المدرسین علامہ شاہ حسین شہید بیدریؒ (متوفی ۱۱۰۸ھ) کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ (۲) اسی طرح شمال میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ)

Mob: 9448166536

نے مدرسہ رحیمیہ دہلی میں قائم فرمایا انہیں دنوں جنوب میں ان کے معاصر خانوادۂ اقطاب ویلور کے جد اعلیٰ حضرت سید شاہ ابوالحسن قربی ویلوری (۱۱۱۸ھ - ۱۱۸۲ھ) نے خانقاہی مدرسہ (لطیفیہ) ۱۱۷۹ھ میں جاری کیا۔

ام المدارس مدرسہ باقیات الصالحات ویلور (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کے بانی حضرت شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری (ولادت ۱۲۴۸ھ وفات ۱۳۳۷ھ) کے والد ماجد حضرت مولانا حافظ شاہ عبدالقادر قادری قدس سرہ (۱۱۹۸ھ - ۱۲۵۱ھ) نے قاضی القضاۃ مولانا محمد ارتضیٰ علی فاروقی خوشنودؔ (۱۱۹۸ھ - ۱۲۷۰ھ) کے دوست اور ہم عمر ہونے کے باوجود ان سے علمی استفادہ بھی کیا، اور ان کی ایما پر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ) کی فارسی تفسیر کو ۱۲۴۹ھ میں عربی جامہ پہنایا اور اس کا نام ''التعریب القادری للتفسیر العزیزی'' رکھا۔ باوجود اس کے سلوک و اصلاح کا تعلق خانوادۂ اقطاب ویلور کے بزرگ حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری محویؔ (۱۱۸۶ھ - ۱۲۴۳ھ) سے تھا، وہ حضرت محویؔ کے نامور خلیفہ و مجاز تھے۔ حضرت محویؔ کے صاحبزادے حضرت سید شاہ عبداللطیف نقوی ویلوری معروف بہ قطب ویلورؒ (۱۲۰۷ھ - ۱۲۸۹ھ) اپنے والد ماجد کے اجازت یافتہ و خلیفہ تھے مگر قیام مکۂ مکرمہ کے دوران حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ (متوفی ۱۲۶۲ھ) سے تبرّکاً و تیمّناً سند حدیث حاصل کی۔(۳) حضرت قطب ویلور کے شاگرد و خلیفہ حضرت شاہ عبدالوہاب قادری بانیٔ مدرسہ باقیات الصالحات نے امام العارفین حضرت شاہ محمد امداداللہ مہاجر مکیؒ (متوفی ۱۳۱۷ھ) اور قیوم دوراں حضرت شاہ فضل رحمان صدیقی نقشبندی گنج مرادآبادی (متوفی ۱۳۱۳ھ) سے بھی فیض پایا اور ان دو بزرگوں کی خلافت واجازت سے بھی بہرہ ور ہوئے۔(۴) حضرت شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادریؒ کے شاگرد و خلیفہ حضرت مولانا شاہ گنڈو محمد عبدالقادر شاکرؔ وانمباڑوی (ولادت ۱۲۸۲ھ وفات ۱۳۴۱ھ) سے وابستہ و فیض یاب ہونے سے پیشتر شیخ الشیوخ حضرت رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء) کی بیعت سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ حضرت شاکرؔ نے اپنی شاہکار مثنوی ''گلزار شاکر'' میں ''مدح پیر'' کے عنوان سے شیخ گنگوہیؒ کی خوب تعریف کی (۵)۔ اسی طرح اپنی کتاب ''صحیفۂ ذکراللہ'' (حصہ اول) (۶) میں اور ''مرثیہ شاکر'' میں شاہ عبدالوہاب قادری کی مدح و ثنا میں زور قلم صرف کیا (۷)۔ حضرت شاکر کی طرح فارسی قواعد، صرف و نحو

اور محاورات وامثال کی تحقیق پر مشتمل معرکہ آرا کتاب ''دستور نامہ فارسی'' کے مصنف مولانا حکیم حسین شریف حُکمی بنگلوری بانیٔ مدرسہ باقیات صالحات شاہ عبدالوہاب قادری سے علمی استفادے کے بعد مولانا ابوالخیرات سید احمد دہلوی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے تلمیذ خاص ہوئے اور پھر گنگوہ پہنچ کر حضرت عارف باللہ رشید احمد گنگوہیؒ کے چہیتے مرید بن گئے۔(۸)

حکمی بنگلوری نے جنوب وشمال کے سرچشمہ ہائے علم وفن سے سیرابی حاصل کی، چونکہ بنگلور کے معروف خاندان اطبا کے چشم و چراغ تھے اس لیے حکمت انہیں وراثت میں ملی تھی، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، بعدازاں ان کا داخلہ حضرت قطب ویلور کے لائق وفائق شاگرد حضرت مولانا محمد قلندر حسین اطہر (متوفی ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء) کے مدرسۂ دینیہ وعربیہ میں ہوا، حضرت اطہرؔ نہ صرف جید عالم و فاضل تھے بلکہ فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر بھی تھے، دفتر ''قاسم الاخبار'' بنگلور کے ماہانہ مشاعروں میں بلاناغہ شریک بھی ہوتے تھے اور شہر استاذ مانے جاتے تھے، مجموعۂ کلام ''مخمّسات وقصائد اطہر'' ۱۲۹۲ھ میں بنگلور سے شائع ہوا (۹)۔ تاریخ گوئی میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی، انہوں نے اپنے مرشد ومحبوب حضرت شاہ عبدالحی احقرؔ بنگلوری (متوفی ۱۳۰۱ھ) خلیفۂ حضرت قطب ویلور قدس سرہ کی تصانیف پر تقریظ بھی تحریر کی اور قطعہ ہائے تاریخ بھی لکھا۔ حضرت اطہرؔ کے شاگرد رشید حسین شریف کو بچپن ہی سے استاذ کی صحبتوں میں شعروسخن کا ذوق پیدا ہوا، جو آگے چل کر حکمی بنگلوری بن کر چاردانگ عالم میں مشہور ہوگیا، علاوہ ازیں مدرسۂ اطہرؔ کے بزرگ ومخلص ساتھی حضرت قاضی محمد عبداللہ حسین خلیل بنگلوری (ولادت ۱۲۷۱ھ وفات ۱۳۳۷ھ) ابن مولانا قاضی اکبر حسین خلیل جن کے شدید اصرار پر حکمی نے اپنی شاہکار کتاب ''دستور نامۂ فارسی'' ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں تحریر کی تھی، حکمی کی علمی وادبی نشوونما کے راست ممدومعاون ہیں اسی لیے حکمی نے خلیل کو اپنا مخلص دوست بلکہ مخدوم تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ ''دستور نامۂ فارسی'' کی تمہید میں وہ رقم طراز ہیں:

''سلامے کہ سرتا سرش رحمت است  سرِ موئے زاں بگزری زحمت است
زحکمیٔ رنجیدہ دل، خستہ جاں  بہ سوئے خلیلؔ آن بدل مہرباں''(۱۰)

اسی کتاب کے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

''آں مخدوم ازمن نامستعد کاہل، بنگارشِ تحقیقاتِ نحوفارسی خواستہ گار

آمدند، بہ ہزاراں تقاضا نامہ نگار آمدند۔"(۱۱)

حضرت حکمی کو قاضی خلیلؔ سے جو شدید لگاؤ تھا اس کا اظہار ان اشعار سے عیاں ہے۔ ؎

خوں نفس کردۂ جگر خواری دل و دیں باختہ سبک ساری
از تپ عشق سخت زار و نحیف نام کردش پدر حسین شریف
تیر حکمیٔ درد خوردۂ دوست ہمہ عالم گواہ ہمتِ اوست(۱۲)

حکمی کے صدیق محترم و خوشہ چین باغ قطب ویلور قاضی خلیل متبحر عالم، قادر الکلام شاعر، بلند پایہ مصنف اور باکمال مترجم ہونے کے علاوہ تاریخ گوئی میں بھی اپنے استاذ اطہر کے عکس جمیل تھے، چنانچہ قاضی خلیل نے اطہر کی وفات پر "طومارِ غم" (۱۲۹۶ھ) کے نام سے مرثیہ لکھا جس میں ۸۱ ترکیبوں سے سالِ وصال برآمد کیا (۱۳)۔ حکمی کو بھی تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب کی ابتدا میں نود یعنی ۹۰ اشعار پر مشتمل منظوم تمہید تحریر کی جس میں کئی مصرعوں سے سالِ تصنیف کا استخراج کیا۔ مثلاً ؎

چو از کار ایں نامہ پرداختم بتاریخ آں فکر ہا ساختم
بہ ناگہ خرد سوئے او یافت راہ کہ "دستور نامہ افادت پناہ"

۱۳۱۰ھ

دگر سال او کلک گوہر سرشت "گلستان نازک خیالی" نوشت

۱۳۱۰ھ

بسالش دگر گوہرِ نغز سُفت "خرد نامۂ ہوش افزائے" گفت

۱۳۱۰ھ

چہ خوش گفتہ ام چشم بدور ازاں دگر سالِ او "بے بہا ارمغاں"

۱۳۱۰ھ

سروشم دگر بارہ اندر نہفت سنش "چشمۂ فیض پائندہ" گفت (۱۴)

۱۳۱۰ھ

علاوہ ازیں حکمی نے صنعت زُبُر بینات اور صنعت تفریق میں بھی بڑی عمدگی سے تاریخ

نکالی ہے۔

حضرت حکمی اپنے استاذ شفیق مولانا قلندر حسین اطہرؔ کی وفات ۱۲۹۶ھ سے قبل جبکہ ان کی عمر چودہ پندرہ سال تھی (ولادت ۱۲۸۰ھ) اپنے مخلص دوست و صائب الرائے مشیر کے مشورے سے آرکاٹ اور ویلور آئے اور وہاں کے جید علما و فضلا کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہے، بالخصوص شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری خلیفۂ حضرت قطب ویلورؒ اور رکن الدین سید شاہ محمد قادری (۱۲۶۹-۱۳۲۵ھ) ابن حضرت قطب ویلور قدس سرہ کے دامانِ تعلیم و تربیت سے وابستہ ہو گئے (۱۵)۔ پھر وہاں سے انہوں نے "دارالعلوم دیوبند" کا رخ کیا، چنانچہ دیوبند سے اپنے محترم دوست قاضی محمد عبداللہ حسین خلیل بنگلوری کو ۱۲۹۵ میں تحریر کردہ خط کا متن ڈاکٹر آمنہ خاتون نے مجلہ "ریاست میسور میں اردو" جلد اول، حصہ اول و دوم میں نقل کیا ہے۔ دارالعلوم میں آپ کے شفیق استاذ مولانا شاہ ابوالخیرات سید احمد دہلوی جو تلمیذ امام بخش صہبائی و مرزا اسداللہ خاں غالبؔ تھے، صدر مدرس کے منصب جلیل پر ۱۳۰۲ تا ۱۳۰۷ھ فائز رہے۔ یہاں یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ حکمی کے دوران طالب علمی ان کے محسن و مربی حضرت شاہ عبدالوہاب قادری نے اپنے مدرسہ باقیات صالحات کے اولین جلسۂ دستار بندی میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کے لیے حضرت مولانا سید احمد صاحب صدر مدرس کو حکمی ہی کے توسط سے دعوت دی، مدرسہ کا یہ پہلا جلسہ ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۸ء منعقد ہوا تھا (۱۶)۔ یہ ممکن ہے کہ اس طویل سفر میں حکمی اپنے استاذ کے ہم سفر رہے ہوں۔ ان کی جودت طبع اور شدید محنت و ریاضت کو دیکھ کر استاذ محترم نے انہیں اپنی خصوصی سرپرستی اور غیر معمولی شفقت و قربت سے نوازا، جس کا اظہار "دستور نامہ فارسی" میں موجود استاذ محترم کی تقریظ سے ہوتا ہے (۱۷)۔ مزید براں قیام دیوبند کے دوران ہی امام العارفین شاہ امداداللہ مہاجر مکیؒ (متوفی ۱۳۱۷ھ) کے خلیفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ) سے بیعت سلوک و ارشاد کا تعلق قائم کر لیا جس کے ثبوت کے لیے حضرت گنگوہیؒ کے لیے استعمال کردہ عقیدت سے معمور الفاظ "سیدی و سندی و وسیلتی فی الیوم و الغد" کافی ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے "دستور نامہ فارسی" کی تحسین و توصیف کرتے ہوئے فرمایا "بندہ کی دانست میں مولوی صاحب مولف نے بہت اچھا لکھا ہے، قابل تحسین ہے۔ کتبہ الراجی برحمۃ ربہ رشید احمد گنگوہی" (۱۸) جب استاذ محترم دارالعلوم دیوبند سے علاحدہ ہو کر ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۵ء میں بھوپال تشریف لے گئے اور وہیں

ان کا وصال ہوگیا(۱۹) تو حکمی حیدرآباد چلے آئے اور ''گلزار حوض'' کے قریب اپنا مطب شروع فرمایا۔ قیام حیدرآباد کے دوران اپنے مشفق و محبوب دوست کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے تیس سال کی عمر میں ''دستورنامۂ فارسی'' کی تسوید کے درپے ہوئے جیسا کہ آپ نے کہا ؂

دریغا جوانی و نوزادگی  که برمهه زدم داغ از سادگی
چوسالِ من از حد سی برگزشت  ازاں رشته ام نیمهٔ قطع گشت
چو برخ گراں مایه از عمر رفت  مرا باید از بزم بزمه گرفت (۲۰)

حضرت حکمی نے اپنی شاہکار کتاب کی تصنیف ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء کے بعد بھی مکمل آٹھ سال اس کے مندرجات سے متعلق مزید غور وفکر کرنے اور اس پر مشاہیر علم وادب کے آراو تقاریظ جمع کرنے میں صرف کیے، تب کہیں جا کر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں اس کی طباعت کی نوبت آئی، اس موقع پر کئی قلم کاروں نے قطع ہائے تاریخ رقم کیے جن میں ماہر فن تاریخ وجمل مولانا حافظ حفیظ اللہ فانی اعظم گڑھی نے درج ذیل ایک اردو اور تین عمدہ فارسی قطعے تحریر کیے، ملاحظہ ہوں ؂

چھپی مجتبائی میں باصد صفائی  یہ نادر کتابِ افادت شمامہ
کہو مصرعِ سال مطبوع فانی  ''چھپا ہے بہت عمدہ دستور نامہ''

۱۳۱۸ھ

حکیم حاذق و علامۂ حسین شریف  نوشت اصولِ قواعد زہے پسندِ طبع
چو سال طبعِ ہمایونش خواستم فانی  سروش گفت بگو ''شد متیں کتابِ طبع''

۱۳۱۸ھ

فوائد نامه چوں در طبع آمد  ندائے ہاتفم گردید مسموع
بگو اے فانیٔ دل شاد تاریخ  ''بشد دستور نامه عمده مطبوع''

۱۳۱۸ھ

شده دستور نامه چوں مطبوع  که افاضات علم راست مآب
گفت تاریخ ہاتفم فانی  ''گشته مطبوع لاجواب کتاب''

۱۳۱۸ھ

اس نادر و بے نظیر کتاب ''دستورنامہ فارسی'' کی مطبع مجتبائی، دہلی سے اعلانِ طباعت کے باوجود شاید انہیں نقاد ادبیات فارسی علامہ شبلی نعمانی ناظم علوم وفنون، سرکار عالی نظام حیدرآباد، دکن وسابق پروفیسر مدرسۃ العلوم، علی گڑھ وفیلو یونیورسٹی، الہ آباد کی گراں قدر تقریظ کا انتظار تھا، جوں ہی علامہ شبلی کی تحریر ملی اسی وقت کتاب کی طباعت شروع کردی گئی۔ علامہ نے کتاب کی خوب تعریف کرتے ہوئے مصنف کو خراج تحسین پیش کیا، تقریظ کے الفاظ یہ ہیں:

''میں نے جناب مولوی حسین شریف صاحب کی کتاب ''دستورنامہ فارسی'' اکثر جگہ سے بغور دیکھی، کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب ایک معرکہ آرا کتاب ہے، مصنف نے مشکل اور اہم مسائل کو بڑی بسط اور تنقید سے لکھا ہے۔ بہت سے اصول اور قواعد خود بھی ایجاد کیے ہیں، مصنّفین سابق سے جابجا اختلاف بھی کیا ہے اور وہاں بہت زور طبع دکھایا ہے، اس قدر ہے کہ یہ کتاب بوجہ دقت مضامین کے منتہیوں کے قابل ہے۔

تشبیہ کی بحث استطراداً موضوع سے خارج آ گئی ہے۔ بہرحال یہ کتاب ہر طرح قدردانی کی مستحق ہے۔'' (شبلی نعمانی ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳۲۱ھ)۔(۲۲)

علامہ شبلی کے قیام حیدرآباد کے زمانے میں حضرت حکمی حیدرآباد ہی میں سکونت پذیر تھے، کتاب کی طباعت ۱۳۲۱ھ اور اشاعت ۱۳۲۲ھ کے بعد ہی وہ ویلور منتقل ہوئے یہی سبب ہے کہ ''دستورنامہ فارسی'' کے ناشر نے کتاب ملنے کے پتوں میں مصنف کا پتہ ''مولوی حکیم حسین شریف صاحب، گلزار حوض، حیدرآباد'' لکھا ہے، جہاں ان کا مطب تھا۔

حضرت حکمی بنگلوری کا قیام حیدرآباد میں ایک دہائی سے بڑھ کر رہا، انہوں نے اپنی عمر کے پانچویں دہائی کی ابتدائی سالوں میں حیدرآباد سے نول پور (نزدِ آرکاٹ) منتقل ہو گئے جہاں اہل خانہ بنگلور شہر سے ہجرت کر کے بود و باش اختیار کر چکے تھے۔ بقول علامہ فدوی باقوی:

''حضرت حکمی قدس سرہ بڑے پائے کے جید عالم اور ماہر طبیب رہے ہیں، آپ کا عظیم الشان کتب خانہ تھا آپ کو حیدرآباد کی فضا راس نہ آئی اور وہاں سے

اپنے وطن نول پور منتقل ہو گئے۔نوابانِ کرناٹک کا اقتدار ختم ہو چکا تھا، کچھ دن آپ نے یہاں اپنا ذاتی مطب چلایا پھر اپنے عزیز دوست حضرت بانی مدرسہ قدس سرہ کے اصرار پر ویلور چلے آئے، یہاں بھی ان کی طبابت کو فروغ نہ مل سکا، بہرحال مطب چلتا رہا اور آپ کا ویلور ہی میں انتقال ہوا اور وہاں کی چھوٹی مسجد کے نام سے مشہور مسجد میں تدفین عمل میں آئی، آپ کے ایک صاحبزادے حکیم عبدالرب صاحب نولپوری جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے نول پور سے میل وشارم منتقل ہوئے اور یہاں مطب شروع فرمایا تھا، بڑے نیک اور صالح، بزرگوں کا نمونہ تھے، آپ سے اس احقر کے آخری دنوں میں مراسم ہوئے .....آپ کو حضرت بانیٔ باقیات قدس سرہ سے انتہائی محبت وعقیدت تھی اور مدرسہ باقیات ویلور کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، حضرت بانی مدرسہ قدس سرہ اور ان کے اپنے والد ماجد نوراللہ مرقدہ کے تعلقات ان کے ہمیشہ پیش نظر رہا کیے۔"(۲۳)

حضرت علامہ فدوی باقوی (متوفی ۱۴۱۴ھ) کے مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہے کہ حضرت حکمی کا وصال شہر ویلور ہی میں ہوا تھا، انتقال سے پیشتر کئی سال حیدرآباد میں قیام پذیر رہے، پھر نولپور میں بھی سکونت رہی، تاہم اپنے تخلص حکمیؔ کے ساتھ ہمیشہ "بنگلوری" لکھا کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی بے نظیر کتاب "دستورنامۂ فارسی" (جس کا تاریخی نام "فوائد غریبہ" ہے) کے سرورق پر بھی ان کے اسم گرامی کے ساتھ حکمیؔ بنگلوری تحریر شدہ ہے۔یہی سبب ہے کہ ڈاکٹر عارف نوشاہی صاحب (اسلام آباد، پاکستان) کو یہ اشکال ہوا کہ "کتاب کے سرورق پر مصنف کی مکانی نسبت "بنگلوری"، لکھی ہے، لیکن کتاب کی پشت پر چھپے ایک اعلان میں اس کا پتہ "گلزار حوض، حیدرآباد دکن درج ہے"۔(ماہنامہ معارف، جون ۲۰۰۵ھ، ص ۴۶۲)اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے زاد بوم ووطن عزیز کو کبھی فراموش نہیں کیا۔علاوہ ازیں یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ فارسی زبان وادب پر مجتہدانہ گرفت اور اس کے قواعد وضوابط کی نقد وجرح میں مہارت وملکہ کا سبب ان کے جید اساتذۂ کرام کا شعر وسخن اور ادب ونقد کے تعلق سے گہرا ربط واشتغال اور اس کا نورانی تسلسل ہے۔حضرت حکمی بنگلوری حضرت اطہر بنگلوری کے شاگرد رشید ہیں، جناب اطہر کے استاذ حضرت قطب ویلور تھے اور انہوں

نے اپنے والد ماجد حضرت محوی سے عربی و فارسی سیکھی، حضرت محوی نے اپنے پدر بزرگوار حضرت ذوقی سے تعلیم حاصل کی اور شاہ ذوقی کے معلم و مربی علامہ شاہ قربی ویلوری تھے۔ بقول اردو کے اولین نقاد علامہ باقر آگاہ ویلوری ''اکثر مردماں تدریس نسخ متداولۂ فارسیہ از حضرت ایشاں (قربی) حظ کامل و نفع شامل گرفتہ اند و دریں ملک ہر کہ ہست از شاگردانِ ایشاں یا شاگرد شاگردان ایشاں'' یعنی اکثر افراد انہی سے فارسی کی کتب متداولہ کی تعلیم کا لطف اور فیضان حاصل کر چکے ہیں۔ اس علاقے میں جو بھی فاضل ہے یا تو براہِ راست ان کا شاگرد ہے یا بالواسطہ شاگرد ہے۔ (خانقاہِ اقطاب ویلور کے علمی آثار ص ۴۹) یہ سبھی اساتذہ اپنے دور کے جید علما، اہل کشف صوفیہ ہونے کے ساتھ با کمال صاحب دیوان شعرا اور بلند پایہ ادیب و نثر نگار تھے۔

''دستور نامہ فارسی'' پر فارسی، عربی اور اردو نظم و نثر میں بہت سے تقاریظ لکھے گئے ہیں، جن میں مشاہیر اساتذۂ سخن و نامور ادبا و شعراء اور مشائخ کرام کی آرا ثبت ہیں۔ مثلاً شیخ الشیوخ مولانا حافظ ابوالمحمود رشید احمد گنگوہیؒ، استاذ الاساتذہ ابوالخیرات سید احمد دہلوی، استاذ مولانا محمد ذوالفقار علی دیوبندی، سلطان العلماء آقا سید علی بن سید ابوالحسن شوستری جزائری، مولانا الحاج محمد ضیا علی، مولانا محمد عبداللہ حسین خلیل بنگلوری، جناب محمد ابراہیم خاں واصف بنگلوری، مولانا خلیل الرحمان خلیل برہان پوری، مولانا حافظ حفیظ اللہ فانی اعظم گڑھی، مولانا حافظ عبدالاحد دہلوی، مولانا نظام الدین عشق کیرانوی، جناب محمد بیگ دہلوی، جناب محمد عبدالجبار خاں آصفی حیدرآبادی اور شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

''دستور نامۂ فارسی'' بظاہر صرف و نحو کے قواعد اور بیان و بدیع کے بعض مباحث پر مشتمل ہے، مگر درحقیقت یہ کتاب فارسی اصول و قواعد کی نقد و تنقیح اور مجتہدانہ تفحص و تلاش کی کامیاب کوشش ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم نقادان زبانِ فارسی اور حاکمانِ مملکت شعر و سخن نے اس کتاب کی خوب تعریف و توصیف فرمائی۔ مثلاً استاذ فن علامہ محمد احسن صاحب صدیقی نانوتوی نے کتاب دیکھ کر فرمایا ''و لا عین رأت و لا اذن سمعت'' (یعنی نہ کسی آنکھ نے ایسی کتاب دیکھی اور نہ کانوں نے کبھی ایسے مضامین سنے) (۲۴) ۲۹۲ صفحات پر مشتمل کتاب کو مصنف محترم نے ایک ہزار ایک سو سے زائد عناوین سے آراستہ کیا ہے جو ۲۰ علاحدہ صفحات پر پھیلے ہوئے

ہیں، اس مایہ ناز تصنیف کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف موصوف نے قواعد و کلیات کے بیان میں اور مباحث کے دوران اساتذۂ سخن کے بے شمار اشعار بطور شہادت پیش کیے اور اپنے دعوے کے لیے انہیں سند و دلیل بنایا، اور جابجا رومی، سعدی، عرفی، حیاتی گیلانی، فیضی، فیاضی، نظامی گنجوی، انوری، فردوسی، مرزا محمد قلی، سلیم طہرانی، امیر خسرو، مرزا غالب، منوچہری، ظہوری، جامی، ملا ضمیری، علی حزیں، جلال اسیر، خواجہ جمال الدین سلمان، نخشبی، میر یحییٰ شیرازی، ملا طرزی، خاقانی، حافظ، طالب آملی، ابوطالب کلیم، شغائی، صائب، عراقی، غنی کاشمیری، سعید اشرف، میر معزی سالک، یزدی وغیرہ اکابر شعر و سخن کے اشعار سے اپنے مطالب پر استشہاد کیا ہے۔

حکمی بنگلوری کا اسلوب بہت ہی صاف و شفاف، طرز ادا دل کش و دل آویز، موضوعات کی فہمائش، مرتب و مدلل ہونے کے علاوہ دقت مضامین کے لیے موزوں الفاظ و امثلہ کا انتخاب زبان و بیان پر ان کی مہارت تامہ و قدرتِ کاملہ کا واضح ثبوت ہے۔ چنانچہ انہوں نے کتاب کے مقدمہ کی ابتدا میں فارسی قواعد کی ضرورت و اہمیت پر بحث شروع کرتے ہوئے اردو قواعد کی جو مثال دی وہ قابل تحسین و لائق تقلید ہے۔ فرمایا:

> ”مقدمہ۔ جاننا چاہیے کہ آدمی کسی زبان کو سیکھنا چاہے، پہلے اس زبان کے قوانین کلیہ کا معلوم کرنا ضروری ہے۔ اس واسطے کہ ”قانون“ یونانی زبان میں بمعنی مسطر کے ہے جیسے کہ آدمی سیدھی سطر لکھنا جانتا نہ ہو بوسیلہ مسطر سیدھا لکھ سکتا ہے۔ اسی طرح جو کوئی کسی زبان کو درستی سے بول نہ سکتا ہو بوسیلہ اس قانون کے اپنے مضمون کو اس زبان میں درستی سے ادا کرسکتا ہے۔ مثلاً اہل دکن لغت اردو بولتے ہیں لیکن علامت فاعل کے استعمال اور فعل کے تابع کرنے میں حیران رہ جاتے ہیں، کہیں فاعل لازم پر علامت فاعلی ”نے“ کو دھرتے ہیں کہیں فعل لازم کو مفعول کے تابع کرتے ہیں، وہ اگر اس قاعدہ کو جان لیں کہ فعل متعدی صیغۂ ماضی معلوم کے فاعل پر علامت فاعل یعنی ”نے“ کو لایا کرتے ہیں اور یہ لفظ ”نے“ فاعل اور فعل کے درمیان کافہ یعنی فاعل کو عمل سے روکنے والا ہوتا ہے، اسی واسطے اس فعل کو تانیث و تذکیر میں تابع مفعول کے کردیتے ہیں جیسے زید نے کتاب لکھی، ہندہ نے خط لکھا۔“ (۲۵)

ان کو اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں پر کامل اعتماد تھا، اسی لیے ایک نظم میں شاعرانہ تعلی سے کام لیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

هر رشحه که از قلم بریزد خمخانه هزار جوش می زد
هر نقطه که از قلم چکیده استاره بزیر آوریده
کلکم نکشید خط، کشیدست در دیدهٔ ناز سرمهٔ مست
هر حرف چه نغمه و ناز زاید زهره به سلام حرفم آید
صد نکته به نقطه ام نهفته صد سحر به نکته ام بخفته
پیش سخنم چه سحر بابل زهره زده زانوم مقابل(۲۶)

حکمی بنگلوری نے اظہار تعلی کے باوجود اپنے استاذ کے احسان و فیضان کو فراموش نہیں کیا بلکہ اپنے کمال ہنر، مہارت فن، ندرت تخیل اور جدت فکر کو استاذ محترم علامہ قلندر حسین اطہر بنگلوری کی نگاہ کرم اور فیض تصرف کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کا اعتراف ہے:

این نقشِ بدیع و این نو آئین از فیض جناب اطہؔر ست این
این جادوم که لاجواب ست ز اعجاز کمال آن جناب ست
این سرخوشیم که در دماغ ست تسخیر شراب آن ریاغ ست
شور ست بخامه ام ازاں مُل گشت ست چراغ مست بلبل
ازوے بدلم هزار رازست هرمن درِ هر خزینه بازست
کلکم چو بوصف حرف کو شد از قطره هزار بحر جو شد(۲۷)

مضمون کے آخر میں کتاب کی ابتدا و اختتام پر تحریر کردہ طویل نظموں سے چند شعر نمونتاً زینت قرطاس کیے جا رہے ہیں تا کہ حکمی کی قادرالکلامی اور رفعت تخیل کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے ہندوستان کے فارسی شعرا میں شاعر موصوف کے مقام و مرتبہ کو متعین کرنے میں نقادان فن کو تکلف و تردد نہ ہو پائے۔

ابتدا:

بنامِ خدائے که جاں آفرید عیاں رابه نیرو نہاں آفرید

ز اسرار ہا گنج دروے نہاد زباں را کلیدِ درِ گنج داد
نہ گنجے زکاہش درو ناگزیر زداد و دہشہا فزایش پذیر
زہے بخت بیدارِ گنجینہ دار کہ سازد چنیں گنج ہر کس نثار
کہ بارید برما ہمہ شہد و شیر زفیضِ ازل ہمچو ابرِ مطیر
زہے جود کو نامدہ در وجود شدہ علتِ بود چرخ کبود
نہ دیدہ کسے آخریں ایں چنیں کہ بودست وے علتِ اولیں (۲۸)

اختتام:

ہمایوں گہر حکمئ نکتہ سنج بچیدہ گہر ہا بر آمودہ گنج
زبانِ دری یا بود پہلوی ازیں نامہ بگرفت سازِ نوی
زتر دستئ او دریں کارو کشت بہر گوشہ بینی بہارِ بہشت
رسانیدہ بہرِ سخن پروراں براہیں زگفتارِ دانشوراں
زدانش سگالاں رباید خرد بناقص خیالاں فزاید خرد
بلب تشنۂ آبِ حیواں دروست بظلمت زدہ مہرِ تاباں دروست
بر آراست زلفِ رسائے سخن بہ مشاطگی ہائے اندازِ فن
خرد را ازو روشنائی بود سخن رابہ گیتی روائی بود
سخن را بود تانشاں درجہاں بود حرز جانِ سخن پروراں (۲۹)

حکمی نے ''دستورنامہ فارسی'' کی شروعات ''سرفرود آوردن خامۂ جادو سے ہنگامہ درسپاس اختتام'' کے جملے سے کیا ہے، پھراس کے نیچے ''دستورنامہ'' لکھ کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر کیا ہے، بعد ازاں نود ۹۰ اشعار کی طویل نظم زیب قرطاس کی ہے، ابتدائی جملے اور بعد کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کے اختتام کے بعد ہی منظوم ابتدائیہ رقم کیا۔ مثلاً

بانصاف بیں ہر چہ من گفتہ ام ہمہ دُرِّ ناسفتہ را سفتہ ام
بیاوردم از کاوش مغز کاہ گہر ہائے روشن تر از مہر و ماہ
ہمہ سر بسر گوہر نابسود کہ از مہر و مہہ گوے سبقت ربود

به بستم دریں نامه آئیں نگر که مانند صنم خانۂ چیں مگر
چو کردم همه راز از سینه باز بجاهست اگر نامش گنج راز
بر آہنگ معنی زدم ساز را چه آساں کشادم درِ راز را
ہر آں مدعا کو غریب اوفتاد بذکر دلیلش قریب اوفتاد
بہر دعوی اش حجت انگیختم زطوِ مُمل رشته بگسیختم
به تفصیل مجمل شدم مشتغل که نامد پسند اختصار مُخل (۳۰)

اس کتاب کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے ہر صفحہ کے حاشیہ پر مشکل الفاظ کے معانی، محاورات کے مطالب اور بعض مجملات کی وضاحتیں خود ہی تحریر کی ہیں۔ان کے انتقال کی متعین تاریخ معلوم نہ ہوسکی، البتہ اس قدر ضرور پتہ چلتا ہے کہ ان کی وفات ان کے محسن و مربی حضرت شاہ عبدالوہاب قادری بانئ باقیات کے وصال ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء سے قبل ہو چکا تھا، یہ اس لیے کہ مدرسۂ باقیات کے کتب خانہ میں موجود ''دستور نامۂ فارسی'' کا واحد نسخہ ہے، اس کے سرورق پر پنسل سے اس طرح لکھا ہوا ہے۔''حکیم سید یعقوب صاحب کے وساطت سے پیشتر وقف کردہ حکیم حسین (شریف) مرقوم ۲۴/اپریل ۱۹۱۸ء'' یہ کتاب حیدر آباد کے قیام کے دوران وقف کردی گئی مگر کسی وجہ سے ویلور پہنچ نہ سکی، حکمی صاحب کے وفات کے بعد حکیم سید یعقوب صاحب کے ذریعہ حاصل ہوئی، یہاں یہ اطلاع بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ۱۳۲۴ھ مطابق ۱۹۰۶ء میں ''دستور نامہ درصرف ونحو زبان پارسی'' کے نام سے ایران سے ۳۸۷ صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب شائع ہوئی تھی جس کے مولف دکتور محمد جواد مشکور، استاذ دانش گاہ تہران تھے، اس کتاب کی اشاعت موسسہ مطبوعاتی شرق خیابان، شاہ آباد تہران سے ہوئی۔

---

## مآخذ وحواشی

(۱) راہی فدائی ڈاکٹر،''قدیم ہندوستان میں علوم دین کے سرچشمے'' اقراء پبلی کیشنز، کوئنس روڈ، بنگلور۔ ۵۲۔ مطبوعہ ۲۰۰۹ ص:۳۵۔ (۲) محمد یوسف کوکن عمری افضل العلماء، خانوادۂ قاضی بدرالدولہ (جلد اول) دارالتصنیف، مدراس۔ مطبوعہ ۱۹۶۳ء ص:۱۰۲۔۱۰۳ (۳) راہی فدائی ڈاکٹر ظہیر احمد، شواہد، الانصار پلی کیشنز، حیدر آباد، مطبوعہ ۲۰۱۷ء ص:۹۰ (۴) راہی فدائی ڈاکٹر ظہیر احمد باقوی،''جامعہ باقیات صالحات۔حضرت بانیؒ۔مسلک ومشرب'' ابوالحسان اکادمی، بنگلور مطبوعہ ۲۰۱۲ء ص:۷۹۔۸۳ (۵) شاکر گنڈ وعبدالقادر، گلزار شاکر، مطبوعہ مطبع شوکت الاسلام، بنگلور ۱۳۲۶ھ ص:۵ (۶) شاکر گنڈ وعبدالقادر، صحیفۂ ذکر اللہ، مطبوعہ مطبع شاہ الحمیدیہ مدراس ۱۳۳۸ھ ص:۴ (۷) شاکر گنڈ وعبدالقادر، مرثیہ

شاکر، مطبوعہ مطبع گلزار حسینی، بمبئی ۱۳۲۷ھ ص:۵(۸) حسین شریف حکیم مولانا حکمی بنگلوری ''دستور نامۂ فارسی'' مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء ص:۲۸۵ (۹) سید احمد ایڈوکیٹ بنگلوری، ''نیر اعظم'' مطبوعہ کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور ۱۹۸۲ء ص:۱۵ (۱۰) حسین شریف حکیم حکمیؔ بنگلوری ''دستور نامۂ فارسی'' ص:۸ (۱۱) ایضاً ص:۱۰ (۱۲) ایضاً ص:۱۰ (۱۳) آمنہ خاتون ڈاکٹر، مولوی محمد خاں، ریاست میسور میں اردو، جلد اول (حصۂ اول و دوم) مطبوعہ مہارانی کالج، میسور ۱۹۶۰ء ص:۱۷۶ (۱۴) ''دستور نامہ فارسی'' ص:۵-۶ (۱۵) اس کا تحریری ثبوت راقم الحروف کو کسی کتاب میں دستیاب نہیں ہوا، البتہ استاذ محترم علامہ فدوی باقوی (متوفی ۱۴۱۴ھ) کی موقر کتاب ''مجدد جنوب'' (مطبوعہ دارالاشاعت مدرسۂ باقیات صالحات، ویلور ۱۹۷۴ء) میں حضرت حکیم حسین شریف حکمی بنگلوری کے فرزند ارجمند حضرت حکیم عبدالرب نول پوری ثم میل وشاری کے حوالے سے بیان کردہ واقعات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ حضرت حکمی کا عقیدت مندانہ تعلق و ربط بانی مدرسہ باقیات صالحات شاہ عبدالوہاب سے دیرینہ رہا ہے۔(۱۶) ''جامعہ باقیات صالحات، حضرت بانیؒ، مسلک و مشرب'' ص:۷۴ (۱۷) ''دستور نامہ فارسی'' ص: ۲۸۲- ۲۸۳ (۱۸) ایضاً ص:۲۸۲ (۱۹) محبوب رضوی سید، تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد دوم ادارۂ اہتمام دارالعلوم دیوبند مطبوعہ ۱۹۷۸ء ص:۱۷۸ (۲۰) ''دستور نامۂ فارسی'' ص:۴ (۲۱) ایضاً ص:۲۸۹ (۲۲) ایضاً ص:۲۹۲ (۲۳) فدوی باقوی ویلوری علامہ ''مجدد جنوب'' مطبوعہ دارالاشاعت، مدرسہ باقیات صالحات، ویلور ۱۹۷۴ء ص:۴۴-۴۵ (۲۴) ''دستور نامۂ فارسی'' ص اعلان ۲۹۳ (۲۵) ایضاً ص:۱۲-۱۳ (۲۶) ایضاً ص:۱۱-۱۲ (۲۷) ایضاً ص:۱۲ (۲۸) ایضاً ص:۲ (۲۹) ایضاً ص: ۲۹۲ (۳۰) ایضاً ص:۳۔

---

# شری مد بھگوت گیتا اور مسلم مصنّفین

ڈاکٹر ٹی۔آر۔رینا

(۳)

تیسرا ادھیائے کرم یوگ یعنی انسانی افعال سے تعلق رکھتا ہے، جب تک انسان قید حیات میں ہے افعال اس کے لیے لازمی ہیں۔ اسے ان سے نجات نہیں مل سکتی۔

سب افعال قدرت یعنی پراکرتی سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کی حرکت سے کل عالم متحرک ہے، ذات پاک بے لوث ہے۔ جو شخص حواس کو شوق و نفرت کا مطیع نہیں ہونے دیتا، دلی تعلق اور انانیت کو ترک کرکے افعال کو قدرت کا باعث سمجھتا ہے، وہ آخر میں افعال کی پابندی سے چھوٹ جاتا ہے، کیونکہ وہ پھل کی اِچّھا (خواہش) نہیں رکھتا۔ اشلوک ۳۔۹:

دل محمد صاحب کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

۳۔ سن اے میرے معصوم ارجن ذرا
دیے راستے میں نے دونوں بتا
ہے گیان ان کا رستہ جو گیانی ہیں لوگ

۴۔ کہ انساں کبھی ترک اعمال سے
رہا ہو نہ کرموں کے جنجال سے
فقط ترک اعمال سے ہے محال
کہ حاصل کسی کو ہو اوج کمال

---

الیف ۷ ۲۳، لوئر ہری سنگھ نگر رہاڑی کالونی، جموں ۱۸۰۰۰۵۔ (Mob: 9419828542)

۵۔ جہاں میں نہ دیکھو گے تم ایک پل
کہ کوئی بھی فارغ ہے اور بے عمل
سبھی کام کرنے پہ مامور ہیں
گنوں ہی سے فطرت کے مجبور ہیں

۶۔ جو اشیا سے روکے قوائے عمل
مگر دل سے خواہش نہ جائے نکل
جو اشیا کی الفت میں سرشار ہے
پراگندہ دل ہے وہ مکار ہے

۷۔ مگر لے قوائے عمل سے جو کام
کرے پہلے من سے حواس اپنے رام
لگاوٹ نہ اس کی ثمر کا خیال
تو ہے کرم یوگی وہی باکمال

۸۔ جو ہے فرض تیرا کر اس پر عمل
کہ ترک عمل سے ہے بہتر عمل
عمل چھوڑ دینے ہوں تجھ کو تمام
تو مشکل ہے تیرے بدن کا قیام

۹۔ عمل جس قدر بھی ہیں یگ کے سوا
وہ دنیا کو بندھن میں رکھیں سدا
کیے جا تو سب کام یگ جان کر
لگاوٹ نہ رکھ روا نہ پھل پر نظر

محمد اجمل خاں صاحب کو سنیے:

۳۔اے معصوم شخص اس دنیا میں دو راستے ہیں، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، سانکھیوں کے لیے عرفان کا یوگ ہے اور یوگیوں کے لیے عمل کا یوگ (یا راہ عمل) ہے۔

۴۔وہ شخص جو عمل نہیں کرتا، وہ عمل سے آزادی نہیں حاصل کرتا اور نہ وہ درجہ کمال تک صرف ترک عمل سے پہنچ سکتا ہے۔

۵۔نہ کوئی ایک لمحہ کے لیے بھی مجہول رہ سکتا ہے، اس لیے کہ مجبوراً ہر شخص ان صفات (گُنوں) کی وجہ سے جو قدرت سے پیدا ہوتی ہیں، عمل کی طرف جاتا ہے۔

۶۔جو شخص اپنے حواس کو ضبط کر لیتا ہے لیکن اپنے دل میں اشیائے حواس کو جگہ دیتا ہے، اس گمراہ کو ریا کار کہتے ہیں۔(بادہا خوردن و ہشیار نشستن سہل است/گر بدولت برسی مست نگروی مردی)

۷۔لیکن وہ جو حواس کو اپنے قبضہ میں رکھ کر اعضائے عمل سے عملی یوگ کرتا ہے اور اپنا تعلق کسی سے نہیں رکھتا، وہ افضل ہے۔

۸۔لہٰذا تو عمل صالح کر، کیونکہ عمل بہتر ہے ترک عمل سے اور بغیر عمل کیے جسم تک کو زندہ رکھنا ناممکن ہے۔

(ابی ثعلبہ سے حدیث مروی ہے کہ: عمل نیک وہ ہے جس سے انسان کی روح کو سکون ہوتا ہے، اور دل میں اطمینان پیدا ہوتا ہے، اور گناہ وہ ہے جس سے نہ انسان کی روح کو سکون ہوتا ہے نہ دل میں اطمینان)۔

۹۔دنیا عمل کی زنجیروں میں بندھی ہوئی ہے، سوائے اس عمل کے جو قربانی کے لیے کیا جائے، اے کُنتی کے بیٹے! قربانی کے لیے عمل کر، مگر بے نیاز ہو کر۔

نواب جعفر علی خاں اثر کے منظوم خیالات سنیے، اشلوک ۳ تا ۹ تیسرے ادھیائے کرم یوگ کے:

۳۔ وہی میں ہوں اور پھر وہی اضطراب
دوبارہ ہوئی دل کی حالت خراب
بتا دیجیے اب وہ رستا مجھے
کہ جس میں بھلائی ہے میرے لیے

۴۔ ہوئے کیشو اس طرح گرم سخن
کہ ”اے نازش صد بہار چمن“
پے اہل دنیا میں دو راستے
خرد مند کے ہیں یہی مدرسے
ہے اک سانکھ اور یوگ ہے دوسرا

یہ ہے گیان ، وہ کرم کا راستا
یہ دونوں ہیں لیکن حقیقت میں ایک
کہ ہے کام اچھا جو نیت ہے نیک
نہ ہو فعل سرزد ، مگر قصد تھا
تو گویا وقوع عمل ہوگیا
نہ کرنا بچاتا نہیں کرم سے
کہ ہے ربط اس کو دل گرم سے
فقط ترک سے کب وہ کامل ہوا
جو سعی عمل پر نہ مائل ہوا
کبھی راہ مقصود پاتا نہیں
کمال اس طرح ہاتھ آتا نہیں
معطل نہیں ایک پل بھی کوئی
خلاف اس کے فطرت ہے انسان کی
تصور عمل ہے ، تخیل عمل
تعطل کا پھر کون سا ہے محل
بظاہر معطل جو انسان ہے
تو جولاں خیال اس کا اس آن ہے
تقاضائے تن کو دبایا تو کیا
طبیعت کا میلان اُدھر ہی رہا
نہ سمجھا یہاں کے فراز و نشیب
شکار اپنا آخر ہوا خود فریب
مگر جس کا تن ہے قوی ، من قوی
جو خدمت کیا کرتا ہے روح کی

جو خواہش سے مغلوب ہوتا نہیں
بری باتوں میں وقت کھوتا نہیں
خیالات نیک اور اطوار نیک
شریف اس کا نفس اور کردار نیک
وہ مد نظر نفع رکھتا نہیں
نتیجے کو اس سے پرکھتا نہیں

ڈاکٹر شان الحق حقی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

۳۔ کہا بھگوان نے اے صالح جواں، جیسے کہا میں نے
جہاں میں گیان یوگ اور کرم یوگ سوے ہیں دو سیدھے
۴۔ نہ پائے گا کوئی منزل فقط سنیاس ہی لے کر
نہ ہوگا دھرم ہی پختہ فقط بن باس ہی لے کر
۵۔ نہ ہو جامد کوئی پل بھر، عمل فطرت کا منشا ہے
عمل، توفیق جس کی اور موقع اس نے پایا ہے
۶۔ اگر وقت ریاضت من ہو مایا کی طرف پھٹکا
تو یہ کیا ہے، بناوٹ اور فریب نفس ہے گویا
۷۔ جو ہر ترغیب سے بچ کر رکھے قابو حواسوں پر
پھلے گا کرم یوگ اس کا، وہی ہے افضل و برتر
۸۔ بجا لاؤ وہ تن من سے فرائض تم پہ ہیں جو بھی
نہیں آتی ہے ہرگز اس جسم و جاں کو بے کاری
۹۔ کرو وہ کام حاصل جس سے ہو وشنو کی خوشنودی
بکھیڑوں سے زمانے کے نہ حاصل ہوگی بہبودی

چوتھا ادھیائے کرم سنیاس یوگ ہے، بھگوان شری کرشن جی مہاراج ارجن سے فرماتے ہیں، آتما لازوال اور قدیم ہے۔ پراکرتی کائنات قدرت کی کرشمہ سازیوں سے روح بار بار جنم لیتی ہے۔ جو

انسان بے تعلق فعل کے ذریعے ریاضت کرتا ہے وہ سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔ مجھے سب کے جنم ومرن کی خبر ہے، اس کرۂ ارض پر جب نیکی گھٹ جاتی ہے اور برائی کا غلبہ ہوجاتا ہے تو اسے ختم کرنے اور نیکی کو استوار کرنے کے لیے میں وجود اختیار کرتا ہوں اور وہی وجود اوتار کہلاتا ہے۔ اشلوک ۵ تا ۹ میں اس کا خاص ذکر ہے، دل محمد صاحب کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

۵۔ سن ارجن ہوئے ہیں یہاں بار بار
تمہارے ہمارے جنم بے شمار
مجھے حال ان سب کا معلوم ہے
ترا حافظہ ان سے محروم ہے

۶۔ مری ذات ہے مالک کائنات
نہ اس کو ولادت نہ اس کو ممات
جو کام اپنی فطرت لاتا ہوں میں
ظہور اپنی مایا سے پاتا ہوں میں

۷۔ تنزل پہ جس وقت آتا ہے دھرم
اَدھرم آکے کرتا ہے بازار گرم
یہ اندھیر جب دیکھ پاتا ہوں میں
تو انساں کی صورت میں آتا ہوں میں

۸۔ بھلوں کو بروں سے بچاتا ہوں میں
بروں کو جہاں سے مٹاتا ہوں میں
جڑیں دھرم کی پھر جماتا ہوں میں
عیاں ہو کے یگ یگ میں آتا ہوں میں

۹۔ جو ارجن سمجھ لے ان اسرار کو
خدائی جنم اور کردار کو
وہ مرکر میرے وصل سے شاد ہے

تناسخ کے چکر سے آزاد ہے

محمد اجمل خاں صاحب کا ترجمہ دیکھیں:

۵۔اے ارجن! تیرے اور میرے بے شمار جنم گزر چکے ہیں۔میں ان سب کو جانتا ہوں لیکن تو نہیں جانتا۔

۶۔اگرچہ میں نے پیدا ہونے والا، نہ فنا ہونے والا جوہر اور سب مخلوقات کا مالک ہوں تاہم میں اپنی فطرت کے سہارے اپنی قدرت سے دنیا میں جنم لیتا رہتا ہوں۔

۷۔اے بھارت! جب کبھی دھرم کمزور ہوجاتا ہے اور اَدھرم ترقی پر ہوتا ہے تو میں خود جنم لے لیتا ہوں۔ (اوتار دھارن کرتا ہوں)

۸۔نیکوں کی حفاظت اور بدوں کی بیخ کنی کے لیے نیز نیکی (دھرم) کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے میں ہر زمانہ میں اپنا ظہور کرتا رہتا ہوں۔

۹۔وہ جو اس طرح میری خدائی آفرینش ادا کرم (عمل) سے آگاہ ہے اور اس راز کو جانتا ہے، وہ جب جسم کو چھوڑتا ہے تو دوبارہ جنم نہیں لیتا، بلکہ اے ارجن! وہ میرے پاس چلا آتا ہے (یعنی آواگون سے چھوٹ جاتا ہے)۔

اب نواب جعفر علی خاں اثر صاحب کا ترجمہ دیکھیے:

۵۔ نہ جانے جنم میں نے کتنے لیے
اور ارجن اسی طرح تو نے لیے
مجھے یاد تجھ کو فراموش ہیں
یہاں ہوش والے بھی مدہوش ہیں
یہ ہے فرق میں آفریدہ نہیں
گلستاں کی شاخ بریدہ نہیں
اَمٹ اور قابو میں کل کائنات
زمان و مکان و حیات و ممات
مگر اس کے باوصف آتا ہوں میں
پیالے یہاں آکے جاتا ہوں میں
وسیلہ بناتا ہوں مایا کو میں

کرشمے دکھاتا ہوں دنیا کو میں
جہاں قدر نیکی کی گھٹنے لگی!
گراں جنس مٹی میں اٹنے لگی
بدی پھیل جاتی ہے جب دور دور
تو اس وقت ہوتا ہے میرا ظہور
جو ہیں نیک ان کی مدد کام ہے
بدوں کو تباہی کا پیغام ہے
کہ نیکی کا ہو پھر جہاں میں رواج
رہ راست پر آئے بگڑا سماج
جو سمجھا مجھے چشمہ تخلیق کا
جو پیرو ہوا صدق دل سے مرا
وہ پیدائش نو بنو سے چھٹا
نہ پھر گوشت کے بوجھ سے دم گھٹا

ڈاکٹر شان الحق حقی نور عرفاں سے متعلق کیا کہتے ہیں سنیے:

۵۔ کہا بھگوان نے میں اور تم بہت جنموں سے ہیں گزرے
تمہیں بھولے، مگر شہزور سب وہ چت میں ہیں میرے
۶۔ اَ جایا ہوں ، نہیں مٹتی ہے ہرگز آتما میری
پلٹ آتا ہوں میں لے کر وہی پیکر جو تھا اصلی
۷۔ جہاں میں دھرم جب بگڑے، اَست کا جب بھی ہو غلبہ
تو آتا ہوں میں ارجن! بول کرنے دھرم کا بالا
۸۔ چلا آتا ہوں میں بھگتوں کو ہر یگ ، آسرا دینے
بڑھانے دھرم کی شکتی ، سرپھروں کو سزا دینے
اُلوہی جانم اور کرموں کا میرے جس کو عرفاں ہو

بغیر آوا گمن کے پائے گا میری رفاقت کو

پانچویں ادھیائے میں کرم سنیاس اور کرم یوگ کے مختلف ہونے کی صورت کو غلط ثابت کیا ہے۔ یہ دونوں ایک ہی کیفیت قلبی کی صورتیں ہیں۔ سانکھ سے علم حقیقت اور لوگ سے علم معرفت مراد ہے۔ یوگی کی نظر، تمام افعال جسمانی کرتے ہوئے بھی ہمیشہ باطن میں رہتی ہے۔ یوگی کے معنی واصل کے اور سنیاسی کے معنی تارک کے ہیں۔ علم معرفت کے بغیر افعال کا ترک ممکن نہیں اور علم حقیقت کے بغیر وصال ممکن نہیں، لہٰذا سنیاس اور یوگ لازم وملزوم ہیں۔

راقم نے اس ادھیائے میں سے اشلوک نمبر ۳، ۷، ۱۰، ۱۴ اور ۱۸ کا انتخاب کیا ہے۔ آپ دیکھیں کہ دل صاحب، اجمل صاحب، اثر صاحب اور حقی صاحب نے ان کا ترجمہ کس طرح کیا ہے۔ یہی اشلوک حاصل ادھیائے ہیں:

۳۔ سدا سنیاسی اسے جانیے
ہو نفرت کسی سے نہ رغبت جسے
مقید نہ پابند اضداد ہے
سن ارجن وہی مرد آزاد ہے

۷۔ جو سرشار ہے یوگ ہیں مستقل
حواس اس کے بس میں ہیں وہ صاف دل

۱۰۔ رہے بے تعلق کرے جب عمل
خدا ہی کی خاطر کرے سب عمل
خطا سے ہمیشہ رہے گا بری
کنول کے نہ پتے پہ ٹھہرے تری

۱۴۔ وہ مالک عمل اور نہ عاقل بنائے
نہ کرموں کو کرموں کے پھل سے ملائے
یہ مایا کی ہیں کار فرمائیاں
یہ مایا ہی کرتی ہے سب کچھ عیاں

۱۸۔ جو گیانی ہے یکساں نظر اس کو آئے
وہ ہاتھی ہو کتّا ہو یا کوئی گائے
وہ ہو برہمن عالم و برد بار
کہ چنڈال ناپاک مُردار خوار

محمد اجمل خاں کا نثری ترجمہ:

۳۔ اے ارجن! جو شخص نفرت کرتا ہے نہ محبت، جو ضدین سے آزاد ہے اسے دائمی سنیاسی (تارک) سمجھنا چاہیے وہ بہت آسانی سے قید (اعمال) سے چھوٹ جاتا ہے۔

اجمل خاں صاحب نے سانکھیہ کے مفہوم سے متعلق اپنے ترجمے کے مقابل خواجہ اجمیریؒ کا ایک اور خیام کے دو شعر درج کیے ہیں:

پردۂ ہستی بسوزی گر نبار لا الٰہ اثرماں بے پردہ بینیسی نور الا اللہ ما (خواجہ اجمیریؒ)

تادر ہوس لعل و لب جام مئی تادر پے آواز دف چنگ ذئی
اینہا ہمہ حشو است خدا میداند تا ترک تعلق نہ کنی ہیچ نئی (خیام)

۷۔ جو یوگ سے اصلاح یافتہ ہے، متقی ہے اور جس کے حواس نفس قابو میں ہیں، جس نے جملہ مخلوق کی روحوں کے ساتھ اپنی روح کی وحدت کو محسوس کرلیا ہے وہ باوجودیکہ عمل کرتا ہے لیکن اس میں پھنستا نہیں۔

۱۰۔ جو عمل کرتا ہے لیکن اپنے جملہ اعمال کو اس ذات ابدی کی طرف تفویض کر دیتا ہے اور تعلقات (دنیوی) کو ترک کر دیتا ہے۔ وہ گناہوں سے ایسا ہی پاک رہتا ہے جیسے کنول کی پتی پانی کی لہروں سے۔ (جو اللہ پر توکل کرتا ہے وہ اس کے لیے کافی ہے۔ قرآن)

۱۴۔ دنیا کا مالک نہ تو قوت عمل پیدا کرتا ہے نہ اعمال، نہ اعمال و ثمرہ اعمال کا تعلق پیدا کرتا ہے لیکن یہاں محض فطرت کام کرتی رہتی ہے۔

۱۸۔ جو عالم صغیر میں عالم کبیر کو دیکھنے والے ہیں، وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، خواہ وہ عالم و منکسر مزاج برہمن ہو یا گائے، ہاتھی، کتّا، یا کتّا کھانے والا انسان ہی کیوں نہ ہو اور خواہ وہ چنڈال ہو۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

۳۔ اسے ترک میں چاہیے انہماک

رہے نفرت اور خواہشوں سے جو پاک
جب اضداد سے بے نیازی ہوئی
گنوں کی وہیں ختم بازی ہوئی
۷۔ نہ کچھ ہے درنگ اور نہ کچھ باک ہے
عمل بے غرض ، روح بھی پاک ہے
جسے کام آلودہ کرتا نہیں
قدم راہ باطل میں دھرتا نہیں
۱۰۔ حقیقت یہ جب دل نشیں ہوگئی
عمل کا ہے مقصود ترک خودی
۱۴۔ برہم کی جسے یاد ہے اس کے کام
نتیجے رہتے ہیں فارغ مدام
۱۸۔ یہ نشکام یہی وجہہ آرام ہے
یہی امن و راحت کا پیغام ہے
اسی واسطے شق کسی کام کی
نہیں روح کی وجہہ آلودگی

انہی پانچ اشلوکوں کو حقی صاحب نے یوں قلم بند کیا ہے:

۳۔جو کرموں کا نہ چاہے پھل، رہے سنیاس پر عامل　دوئی کو تج کے باہو! جلد ہوگا فائز منزل
۷۔کھرا یوگی جو اپنی اندریوں کو مار رکھتا ہے　اسے سب پیار کرتے ہیں وہ سب سے پیار کرتا ہے
۱۰۔جو حق کا ہوگیا تج کر سبھی کچھ، ایسے گیانی میں　گناہوں کا اثر کیسا ، کنول ہو جیسے پانی میں
۱۴۔وہ عامل ہے نہ بانی ہے، نہ خالق اک عمل کا بھی　نہ تحریک عمل اس کو نہ وہ ترغیب دے اس کی
عمل ہوتے ہیں کچھ خود ہی، تقاضے ہیں جو فطرت کے　اگر سرزد ہوں خود سے بھی تو مطلب کچھ نہیں پھل سے
۱۸۔نظر میں سادھ کی سب خوش نصیب اور بے نصیب ہیں ایک　برہمن، گائے، ہاتھی، کتّا، کتّا خوار سب ہیں ایک

(باقی)

# اخبار علمیہ

## ''مخطوطہ شناسی کی جدید تکنیک''

زندہ قومیں قدیم اور بوسیدہ مخطوطات کی حفاظت اور انہیں دست برد زمانہ سے بچانے کے لیے ہمیشہ مستعد اور چوکنا رہتی ہیں۔ ہندوستان جو مختلف تہذیبوں کا مخزن اور مدفن ہے۔ اس کے تہذیبی ورثے یہاں کی مختلف ذاتی اور سرکاری لائبریریوں میں مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں لیکن عدم واقفیت اور کم علمی کے سبب بہت سے مخطوطات ضائع ہوجاتے ہیں۔ لوگ انہیں نہ صحیح ڈھنگ سے پڑھ پاتے ہیں اور نہ ہی سمجھ پاتے ہیں۔ لیکن ایک خبر کے مطابق جدید تکنک یعنی ڈیجیٹل امیجنگ جس میں الٹرا وائلیٹ شعاعیں استعمال کی جاتی ہیں ان کی مدد سے بوسیدہ ترین، ناصاف اور انتہائی دھندلے مخطوطات کو بھی پڑھا، سمجھا اور بعد میں اسے فوٹو لیتھوگرافی تکنک کے ذریعہ سلیکون کے اوراق پر چھاپا جاسکتا ہے۔ ۲۰۰۶ء سے یہ کام ایک امریکی کمپنی میگا ویژن کی فراہم کردہ ڈیجیٹل امیجنگ مشین کی مدد سے بنگلور میں قائم ادارہ تارا پرکاشن کر رہا ہے اور اس نے اب تک ۳ہزار مخطوطات کو امسرنو ڈیجیٹل دستاویزات کی شکل میں محفوظ کرلیا ہے۔ (دی ہندو، بحوالہ اردو سائنس ماہنامہ، دہلی، مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۳۴)

---

## ''زیر زمین پہاڑوں کی نئی دریافت''

زمین کی تہ میں پہاڑوں کی نئی دریافت کے متعلق یہ خبر بھی توجہ سے پڑھی جائے گی کہ ۱۹۹۴ء میں بولیویا میں ۸٫۲ میگنی ٹیوڈ کا زلزلہ آیا تھا۔ اس زلزلہ کے اثرات کا جب بیس سال بعد مطالعہ کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ سطح زمین سے تقریباً ۶۶۰ کلومیٹر نیچے بڑے پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ ماہرین ارضیات نے زمین کے اندرون کو تین حصوں کریسٹ (Crust)، مینٹل (Mantle) اور کور (Core) میں اجمالی طور پر تقسیم کیا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ مینٹل کی نچلی پرت پر موجود ہے۔ اس دریافت کے نتیجہ میں ٹیکٹونک پلیٹس کو مزید بہتر انداز سے سمجھا جاسکے گا۔ (سائنس ڈیلی ڈاٹ کام، بحوالہ اردو سائنس ماہنامہ، دہلی مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۳۴)

---

## ''مراقبہ کی افادیت پر تحقیق''

مراقبہ عربی میں نگرانی ونگہبانی کو کہتے ہیں بعد میں یہ تصوف کے خاص معنی میں بولا جانے لگا، جس کا اصطلاحی مفہوم کسی خاص نقطہ پر اپنے خیال کو مرتکز کرنا یا خاص اوقات میں اپنی عنان توجہ یاد الٰہی کی جانب موڑ دینا ہے۔جدید تحقیق کے مطابق باقاعدہ اسی عمل کو اختیار کرنے سے دماغ میں مثبت تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔اس تحقیق سے وابستہ سارالاڑارا کا کہنا ہے کہ روزانہ مراقبہ کرنے سے مراقب کو ذہنی اور نفسیاتی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔رپورٹ کے مطابق نیورو امیجنگ کے ذریعہ مراقبہ کرنے والے شخص کے دماغ کے گرے میٹر (خاکی حصہ) میں تبدیلی نوٹ کی گئی ہے۔دماغ کے وہ حصے جن کا تعلق یادداشت، خود آگہی دردمندی اور سیکھنے کی صلاحیت سے ہے ان میں اضافہ نوٹ کیا گیا ہے۔مراقبہ نہ کرنے والے شخص میں اس قسم کی کوئی تبدیلی نہیں دیکھی گئی ہے۔۱۶ افراد پر مشتمل اس گروپ کے مراقبہ سیشن شروع کرنے سے دو ہفتہ پہلے FMRI اسکیننگ کی گئی اور اگلے آٹھ ہفتہ تک روزانہ ۲۷ منٹ تک مراقبہ کرانے کے بعد دوبارہ FMRI کی گئی تو ان تبدیلیوں کا انکشاف ہوا۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مراقبہ کے ذریعہ دماغ کے مختلف حصوں میں تبدیلی کرکے خود کو صحت مند بنایا جاسکتا ہے۔(الشفاء طبی ڈائجسٹ، نئی دہلی، مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۵۵)

---

## ''چینی اسکولوں میں روبوٹک یعنی مشینی اساتذہ کا تقرر''

بیجنگ یونیورسٹی کے ڈاکٹریٹ سند یافتہ اور چینی کمپنی ''آئی بنکو'' کے ڈائریکٹر منگ بائی بونے چار برس قبل اپنے دو بچوں کی تعلیم کے لیے روبوٹ استاذ ایجاد کیا تھا اور اب وہ تجارتی مقصد سے ''بنکو'' نامی ایسے استاذ روبوٹ بنا رہے ہیں جو چینی اور انگریزی میں سائنسی، معاشرتی علوم، ریاضی، موسیقی اور عام معلومات سمیت متعدد نصاب پڑھا سکتے ہیں۔ترقی یافتہ ممالک میں مختلف شعبہ ہائے حیات میں روبوٹ سے کام لینے کا رجحان نہ صرف بڑھ رہا ہے بلکہ اس کا چلن عام ہوتا جا رہا ہے۔ایسے میں یہ دلچسپ خبر سامنے آئی ہے کہ چین کے اسکولوں میں مشینی اساتذہ کا تقرر کیا جا رہا ہے۔ابتدائی طور پر کنڈر گارٹن کلاسز کے ڈیڑھ کروڑ سے زائد بچوں کی تدریس کے لیے شعبہ تعلیم نے ہزاروں مشینی اساتذہ کو مقرر کیا ہے جو ننھے طلبہ کو جدید ترین خطوط پر تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔چائنا ڈیلی کی ایک رپورٹ کے مطابق پورے چین کے سینکڑوں کنڈر گارٹن اسکولوں میں ایک لاکھ اساتذہ کی کمی ہوگئی ہے۔طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مدنظر محکمہ تعلیم نے مصنوعی ذہانت کے حامل جدید ترین سافٹ ویئر والے ان روبوٹس کو متعین کیا ہے جو طلبہ و

طالبات کو نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں سے مانوس کرا رہے ہیں۔ طلبہ کو کوئی سبق یا نظم یاد کرانے میں یہ استاذ لاجواب ہیں۔ روایتی حاضری رجسٹر کے بجائے چہرہ شناس سافٹ ویئر کی مدد سے ہر بچہ کی حاضری بڑی خاموشی سے یہ اساتذہ نوٹ کر لیتے ہیں۔ محکمہ تعلیم نے ان مشینی اساتذہ کی نسبت یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انسانوں کے بالمقابل ان کا تجربہ بہت زیادہ مثبت ردعمل سامنے لا رہا ہے۔ یہ انتھک محنت کر سکتے ہیں، تنخواہ اور الاؤنس کی مد میں اخراجات صفر اور ان کے لیے چھٹیوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بچوں کے ساتھ کھیل کود، دوڑ دھوپ اور ان کی ہر قسم کی ذہنی و جسمانی مشق اور ورزش کرا سکتے ہیں، طلبہ کے اندر تعلیمی دلچسپی پیدا کرنے اور ان کو چشم زدن میں اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ اس کے علاوہ اچانک پیش آمدہ کسی مشکل کے وقت یہ مشینی اساتذہ اسکول انتظامیہ کو باخبر بھی کر سکتے ہیں۔ (منصف، حیدرآباد، ۲۸/ فروری ۲۰۱۹ء، ص ۸)

---

## "مکہ کا ایک پارک تجریدی آرٹ کا شاہکار"

العربیہ ڈاٹ نٹ کی ایک خبر کے مطابق "مکہ میں زندگی" کے عنوان سے تقریباً ۳۰ طلبہ، ۱۰۰ طالبات اور ۲۰ ماہر خاکہ سازوں نے مکہ مکرمہ کے ایک پارک کو تجریدی آرٹ کا ایک شاہکار بنا کر اس کا نقشہ ہی بدل دیا۔ انہوں نے خاکوں کی مدد سے پارک میں مختلف تصاویر اور پینٹنگ جمالیاتی حسن کے دلدادہ افراد کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ تھری ڈی پرنٹنگ کی مدد سے انہوں نے معنوی اقدار کے حامل خاکے اور ترقی پسند آرٹ کے بہترین نمونے تیار کیے جنہیں دیکھ کر ہر خاص و عام نے خوب سراہا۔ اس منفرد پروگرام کی ایک رکن طالبہ مریم مولفی کا کہنا ہے کہ اس سے ہم اپنے فن کے اظہار کے ساتھ ساتھ شہریوں کو ایک نئے ماحول سے روشناس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بچوں میں محبت پیدا کرنے کے لیے احسان ہوساوی اور غدیر الروقی نے منفرد کارٹون تیار کیے ہیں، جن کو دیکھ کر بچے خاص طور پر بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ انہیں تھری ڈی ٹکنالوجی کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔ پارک کے مختلف راستوں کو رنگوں سے سجانے والی مریم کلنتن اور مناہل برناوی کا کہنا ہے کہ فن کو زندہ کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ پروگرام کے سپروائزر ڈاکٹر علی احمد القاسم نے انٹرویو میں کہا کہ پارکوں کو مختلف النوع خاکوں سے مزین کرنے کا یہ اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے جس کا مقصد آرٹ کے ماہرین کو اپنے فن کے اظہار کا موقع فراہم کرنا اور شہر مقدس میں پارکوں کو ترقی یافتہ بنانا ہے۔ (اخبار مشرق، نئی دہلی، ۱۲/ مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۴)

ک۔ ص۔ اصلاحی

## آثار علمیہ وتاریخیہ

# ندوۃ العلماء

## (جلسۂ سنگ بنیاد: نومبر ۱۹۰۸ء)

اشتیاق احمد ظلی

۱۹۰۵ء میں ندوہ کے انتظامی امور کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تو علامہ شبلی کو معتمد تعلیمات مقرر کیا گیا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ان کا دائرہ اختیار وعمل تعلیمی امور تک محدود ہوگا۔ لیکن ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے ان کی علاحدگی تک کے واقعات سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس پورے عرصے میں انجام پانے والے وہ تمام کام جن کا ندوہ کے اس مخصوص تشخص کی ترکیب وتشکیل میں کلیدی کردار رہا ہے جن کے ذریعہ ندوہ جانا اور پہچانا جاتا رہا ہے اور جو اس کی خصوصیات اور ممیزات میں شمار ہوتے ہیں، ان سب کا سہرا علامہ شبلی کے سر جاتا ہے۔ تعلیم وتربیت کے میدان میں ندوہ نے جو غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں وہ انہی کی جاں فشانیوں کا ثمرہ تھیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس مخصوص میدان کے علاوہ بھی، جو اصلاً ان کا اپنا میدان تھا، اس دور میں ندوہ کی تعمیر وترقی کے تعلق سے جو بڑے اور نمایاں کام انجام پائے وہ بھی بیشتر علامہ شبلی کی کوششوں کے رہین منت تھے۔ اسی بات کو مولانا سید سلیمان ندوی نے اس طرح بیان کیا ہے: ’’جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی تھی اور اس کا کام آگے بڑھتا جاتا تھا، اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بنتا جاتا تھا یعنی ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی جاتی تھی‘‘ (۱)۔ واقعہ یہ ہے کہ ندوہ سے وابستگی کے اس دور میں اس کی خدمت میں انہوں نے اپنے آپ کو بالکل فنا کردیا تھا اور بے حد ضروری ملی کاموں کے علاوہ جن کو وہ ندوہ کے وسیع تر مشن ہی کا حصہ سمجھتے تھے وہ سب کچھ بھول گئے تھے۔

ابتداء میں ندوہ گولہ گنج کے ایک مکان میں تھا جو نہ تو اس کی ضروریات کی کفایت کرتا تھا اور نہ اس کے شایان شان تھا۔ علامہ شبلی اس سلسلہ میں مولوی ریاض حسن خاں صاحب کو لکھتے ہیں ’’ندوہ کے مکان کی بدحیثیتی اس کو ابھرنے نہیں دیتی‘‘ (۲)۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول ’’مولانا کی نظر میں قسطنطنیہ کے دارالعلوم اور علی گڑھ کا مدرسۃ العلوم تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ مذہبی درس گاہ

ہماری دنیوی درس گاہوں سے ظاہری حیثیت میں بھی کسی طرح کم نہ ہو" (۳)۔ یوں بھی اعلیٰ ذوق اور کمال پسندی ان کی فطرت میں ودیعت تھی۔ چنانچہ ان کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ جو کام بھی ہو وہ بہتر سے بہتر طور پر انجام پائے۔

اس پس منظر میں ندوہ کی تاریخ میں زمین کی حصول یابی اور ادارہ کے سنگ بنیاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زمین کی حصول یابی کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں البتہ ۲۸ رنومبر ۱۹۰۸ء کو اس عظیم الشان عمارت کے سنگ بنیاد کی تقریب، جو اب بھی ندوہ کی سب سے پر شکوہ عمارت ہے، ندوہ کی تاریخ میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ چونکہ اسی کے ساتھ اگلے دو دنوں میں ندوہ کا سالانہ جلسہ بھی تھا، اس لیے اس کی اہمیت دوچند ہوگئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی تقریب تھی۔ اس کے روح رواں بھی علامہ شبلی تھے۔ انتظام وانصرام کے علاوہ دعوت نامہ بھی انہی کے نام سے جاری ہوا تھا جو سرکردہ شخصیات کے علاوہ بہت سے اخبارات کو بھیجا گیا تھا (۴)۔ لیفٹنٹ گورنر سے ارکان ندوہ کا تعارف بھی انہوں نے ہی کرایا (۵)۔

علماء، ریاستوں کے حکمرانوں، حکام اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اس میں شریک ہوئی۔ اس میں علی گڑھ سے بھی ایک مقتدر وفد شریک ہوا تھا۔ ندوہ کے کسی جلسے میں علی گڑھ سے یہ اپنی نوعیت کی پہلی شرکت تھی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں نواب وقار الملک، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، محمد موسیٰ خاں، خان بہادر جعفر حسین خاں، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، سید وحید الدین سلیم اور کالج میں سائنس کے استاد جناب فیروز الدین اس وفد میں شریک تھے۔ اس کے علاوہ مدرسۃ العلوم کے کچھ طلبہ بھی اس اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔

تقریب سنگ بنیاد اور جلسہ سالانہ کا مفصل تذکرہ مولانا سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں محفوظ کردیا ہے (۶)۔ لیکن یہ اس جلسہ کی روداد نہیں ہے جس سے اس تقریب کے متعلق جملہ کوائف معلوم ہوسکیں اور یہ پتہ چل سکے اس جلسہ میں کتنے اجلاس ہوئے اور الگ الگ اجلاسوں میں کیا کارروائی ہوئی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے جب تاریخ ندوۃ العلماء کی طرف رجوع کیا تو سخت مایوسی ہوئی۔ دارالعلوم کی تاریخ کے اس نہایت اہم واقعہ کا جس کے تذکرہ کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی نے پانچ صفحات وقف کیے ہیں صرف اس قدر ذکر ملتا ہے "دارالعلوم کے لیے گورنمنٹ نے ایک وسیع آراضی عطا کی اور درس گاہ کا کام شروع ہوا۔ ایک شاندار جلسہ سنگ بنیاد منعقد ہوا جس میں حکام اور ہر طبقہ کے عمائد نے شرکت کی"۔ (۷)

خوش قسمتی سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹر سید وحید الدین سلیم اس جلسہ میں شریک تھے۔انھوں نے گزٹ کے ۲/دسمبر اور ۹/دسمبر کے شماروں میں تقریب سنگ بنیاد اور جلسہ سالانہ کی مفصل رپورٹ شائع کی جس سے اس تقریب اور جلسہ کی ایسی تفصیلات سامنے آتی ہیں جن کے معلوم کرنے کا اب کوئی اور ذریعہ نہیں۔ یہ رپورٹ ہدیہ ناظرین ہے۔البتہ اس سے وہ ترکیب بند جو علامہ شبلی نے اس جلسہ میں پیش کیا تھا اور بہت مقبول ہوا تھا اور وہ تقریر جو انھوں نے دارالاقامہ کی ضرورت پر کی تھی حذف کردی گئی ہے اس لیے کہ ان کی اشاعت ہوچکی ہے(۸)۔البتہ عام دلچسپی کے لیے یہاں وہ خبر درج کی جاتی ہے جو اس سلسلہ میں گزٹ کے ۲/دسمبر ۱۹۰۸ء کے شمارہ میں ندوۃ العلماء کے عنوان سے میں شائع ہوئی ''شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کا ترکیب بند مطبوعہ ندوہ کے جلسے میں بہت سے لوگوں نے ایک ایک روپیہ قیمت پر خریدا۔نواب علی حسن خاں صاحب نے تیس روپیہ قیمت پر خریدا۔ راجہ نوشاد علی خاں صاحب، رئیس جہاں گیر آباد، حافظ محمد حلیم صاحب، رئیس کانپور، امام جامع مسجد، دہلی اور بہت سے صاحبوں نے دارالعلوم کے بورڈنگ ہاؤس کے لیے ایک ایک کمرہ بنوادینے کا وعدہ کیا۔ جن صاحبوں نے سالانہ رقموں کا وعدہ کیا ان کے نام مع رقوم موعودہ کے حسب ذیل ہیں:

نواب علی حسن خاں صاحب ۲۰۰ روپیہ، محمد حسن صاحب مقبہ ۱۰۰ روپیہ، کرنل عبدالحمید خاں صاحب ۱۰۰ روپیہ، منشی احتشام علی صاحب ۱۰۰ روپیہ، خواجہ فریدالدین صاحب، آنریری مجسٹریٹ، لکھنؤ ۵۰ روپیہ، مولوی برکت اللہ صاحب، نائب ریاست، بلرام پور ۵۰ روپیہ، مولوی حفیظ اللہ، نائب تحصیل دار پروا، ضلع اناؤ ۵۰ روپیہ، سید محمود عالم، رئیس فیض آباد ۵۰ روپیہ، مرزا ظفر اللہ صاحب، سب جج، جالندھر ۵۰ روپیہ، قربان احمد صاحب، وکیل بارہ بنکی ۲۵ روپیہ وغیرہ۔سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ گورنمنٹ نے ندوہ کے دارالعلوم کے لیے انگریزی، ریاضی، عربی قدیم کی تعلیم کے لیے ۵۰۰ روپیہ ماہوار کی امداد دی ہے۔(۹)

سید وحید الدین سلیم وضع اصطلاحات میں بڑی مہارت رکھتے اور اس کام سے وابستہ تھے۔ اس وقت جو اصطلاحات وضع کی گئی تھیں ان میں سے بعض تو مقبول ہوئیں اور زبان کا حصہ بن گئیں اور ان میں بہت سی ایسی بھی تھیں جو قبول عام حاصل نہیں کرسکیں اور وقت کی گرد میں دب کر نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔اس رپورٹ میں بھی ایسی کئی نوساختہ اصطلاحیں استعمال ہوئی ہیں۔ان میں سے والنٹیر

کی جگہ پر رضا کار کی اصطلاح کو قبول عام حاصل ہوا لیکن اسٹیج کے لیے مقامہ، انکوائری آفس کے لیے دریافت خانہ، ڈائننگ ہال کے لیے تناول خانہ، میجک لینٹرن کے لیے فانوس جادو اور ڈیبوینٹش کے لیے بیانی ارسالیہ کو قبول عام حاصل نہیں ہوا۔ یہ تمام اصطلاحیں اس رپورٹ میں استعمال ہوئی ہیں۔

# ندوۃ العلماء

## (جلسہ سنگ بنیاد: نومبر ۱۹۰۸ء)

### سید وحید الدین سلیم

دار العلوم ندوہ کا سنگ بنیاد رکھے جانے اور ندوہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہونے کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں، جن کے متعلق تمام اسلامی اخباروں میں اعلان کیا جا چکا تھا اور بزرگان قوم اطراف ملک سے مدعو کیے گئے تھے۔ چنانچہ پنجاب، ممالک متحدہ اور دیگر اطراف ملک سے بہت سے معزز مسلمان ان جلسوں میں شریک ہوئے۔ علی گڑھ سے نواب وقار الملک، حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، مسٹر فیروز الدین بی۔ ایس۔ سی، اسسٹنٹ پروفیسر سائنس، خان بہادر سید جعفر حسین خاں صاحب اور خاکسار ایڈیٹر ۲۷ نومبر کو لکھنؤ ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب دوسرے رستے سے لکھنؤ پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر ندوہ کے نوجوان والنٹیر (رضا کار) ندوہ کا خوش نما بیج سینے پر لگائے موجود تھے جو ہر ٹرین پر آتے اور مہمانوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

گورنمنٹ نے ندوہ کو جو قطعہ زمین عطا فرمایا ہے وہ کیننگ کالج کے بورڈنگ ہوس کے پہلو میں ہے۔ اس میدان میں دور تک خیموں کی قطاریں نظر آتی تھیں جو مہمانوں کے لیے نصب کیے گئے تھے۔ بیچ میں ایک شاندار پنڈال جلسے کے لیے بنایا گیا تھا جس میں قطار در قطار کرسیاں نہایت ترتیب اور سلیقے سے بچھائی گئی تھیں۔ کرسیوں کی قطاروں کے آگے ایک اسٹیج (مقامہ) بنایا گیا تھا جس پر گلنار اور زرنگار قالین بچھے ہوئے تھے اور ایک میز کے پیچھے دو مرصع کرسیاں ہز آنر لیفٹیننٹ گورنر اور ان کی لیڈی صاحبہ کے لیے رکھی گئی تھیں۔ مقامہ کے گرد بہت سی اعلیٰ درجہ کی کرسیاں معزز لوگوں کے لیے بچھائی گئی تھیں۔ پنڈال کے آگے ایک خیمہ میں ندوہ کا دفتر تھا اور ایک خیمے پر انجمن المعین کا نشان "نخلہ" دور سے دکھائی دیتا تھا۔ ایک خیمے میں دار العلوم کے طلبہ نے چائے، بسکٹ، میوہ اور مٹھائی کی دوکان کھول رکھی تھی۔ قسطنطنیہ کی مطبوعہ عربی کتابیں فروخت کے لیے سجائی گئی تھیں۔ ایک طرف ندوہ کا انکوائری آفس

(دریافت خانہ) تھا۔ایک وسیع خیمہ ڈائننگ ہال (تناول خانہ) کے لیے مخصوص کیا گیا تھا جس میں مہمانوں کو دونوں وقت کھانا کھلایا جاتا تھا۔کھانا جو مہمانوں کو دیا جاتا تھا وہ نہایت عمدہ اور خوش ذائقہ ہوتا تھا۔ارکان کے لیے دو روپیہ اور تماشائیوں کے لیے ایک روپیہ کا ٹکٹ مقرر تھا۔ایک خوشنما مصنوعی دروازہ بھی ہز آنر کی تشریف آوری کے لیے بنایا گیا تھا۔دارالعلوم ندوہ کے نوجوان رضا کار اپنے سینوں پر خوش نما بیج لگائے ہر طرف دوڑتے پھرتے تھے اور ان کے چہروں پر مستعدی اور گرم جوشی کے آثار نمایاں تھے اور مہمانوں کے لیے ہر خدمت اور ہر کام نہایت سرگرمی اور ہوشیاری سے انجام دیتے تھے۔

دارالعلوم کا سنگ بنیاد: ۲۸ نومبر کو تین بجے کا وقت ہز آنر کی تشریف آوری کے لیے مقرر تھا۔ وقت مقررہ سے دو گھنٹہ پہلے پنڈال کی تمام کرسیاں لوگوں سے بھر گئیں۔معزز ہندوستانی اور یورپین صاحبوں میں سے جو اس موقع پر پنڈال میں تشریف فرما ہوئے چند کے نام اس موقع پر لکھے جاتے ہیں: صاحب چیف سکریٹری، گورنمنٹ، صاحب کمشنر لکھنؤ، صاحب ڈپٹی کمشنر لکھنؤ، مسٹر پیری، پرنسپل کیننگ کالج لکھنؤ، مسٹر ڈبلیووارڈ، مسٹر کیمون وغیرہ مع چند معزز یورپین لیڈیوں کے۔راجہ صاحب محمود آباد، راجہ صاحب، جہانگیر آباد، کرنل عبدالمجید خاں صاحب، وزیر خارجہ ریاست پٹیالہ، نواب وقارالملک بہادر، محمد حسن صاحب، مقبہ، جسٹس آف پیس بمبئی، حاجی شمس الدین صاحب جنرل سکریٹری انجمن حمایت الاسلام، لاہور، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب، حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب، امام مسجد جامع، دہلی، خان بہادر شیخ غلام عارف صاحب (از امرتسر)، خان بہادر مولانا شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی، مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی، راجہ نوشاد علی خاں صاحب، نواب علی حسن خاں صاحب بہادر، مولانا مسیح الزماں صاحب وغیرہ وغیرہ۔ اخباروں کے ایڈیٹروں میں سے ایڈیٹر، رسالہ 'مخزن' (دہلی)، ایڈیٹر اخبار 'البشیر' (اٹاوہ)، ایڈیٹر، اخبار 'ہندوستان' (لکھنؤ)، ایڈیٹر، 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' (علی گڑھ)، یڈیٹر، اخبار 'ذوالقرنین' (بدایوں)، ایڈیٹر، 'حبیب الاخبار' (بمبئی)، ایڈیٹر، اخبار 'جدوجہد' (شاہ آباد ضلع ہردوئی) وغیرہ موجود تھے۔

ٹھیک تین بجے ہز آنر مع لیڈی صاحبہ موٹر کار پر تشریف فرما ہوئے۔ پنڈال میں ہز آنر کے داخل ہونے پر تمام حاضرین سرو قد کھڑے ہو گئے۔ جب ہز آنر کرسی پر جلوہ افروز ہو چکے تو سب سے اول قاری حسن آفندی (ملازم دارالعلوم ندوہ) نے مصری لہجہ میں قرآن مجید کا ایک رکوع پڑھ کر سنایا۔

اس کے بعد ہز آنر نے ارکان ندوہ کو ایڈریس پڑھنے کی اجازت دی۔ چنانچہ مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹرایٹ لا نے نہایت عمدگی سے ایڈریس انگریزی زبان میں پڑھ کر سنایا۔ ایڈریس پڑھے جانے کے وقت ارکان ندوہ ہز آنر کے سامنے مودبانہ کھڑے رہے۔ ایڈریس کے ختم ہونے پر ہز آنر اپنی کرسی سے اٹھے اور ایڈریس کے جواب میں تقریر کی۔ ایڈریس مذکور انگریزی، عربی اردو زبان میں چھاپ کر حاضرین کو تقسیم کیا گیا تھا۔ ہز آنر کی تقریر کا اردو ترجمہ بھی جو پہلے سے چھاپ لیا گیا تھا، اس موقع پر تقسیم کیا گیا، ایڈریس اور ہز آنر کی تقریر اسی اشاعت میں دوسرے موقع پر درج کی گئی ہے۔

جب ہز آنر اپنی تقریر کر چکے تو دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے پنڈال سے باہر تشریف لے گئے۔ ہز آنر کے ساتھ اس وقت ندوہ کی طرف سے پانچ معزز ارکان اس رسم میں شریک ہوئے۔ یورپین صاحبوں اور یورپین لیڈیوں نے بھی اس رسم میں شرکت کی۔ باقی تمام حاضرین پنڈال میں رہے اور یہ امر پہلے سے قرار دیا گیا تھا۔ سنگ بنیاد نصب کرنے کے بعد ہز آنر واپس پنڈال میں تشریف لائے اور آپ نے چند حوصلہ افزا الفاظ ندوہ اور دارالعلوم کی آیندہ ترقی کی نسبت اپنی زبان مبارک سے فرمائے جس کا حاضرین پر نہایت گہرا اثر ہوا۔ آخر میں راجہ تصدق رسول خاں صاحب نے ندوہ کی طرف سے ہز آنر کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ ہز آنر کے لیے تین چیرز پروپوز کیے گئے جو نہایت جوش وخروش کے ساتھ دیے گئے۔ اس کے بعد ہز آنر مع لیڈی صاحبہ موٹر کار پر سوار ہوکر رخصت ہوئے۔ تشریف آوری اور واپسی کے وقت ہز آنر نہایت خوش معلوم ہوتے تھے اور لوگوں کے سلام کا جواب مسکرا کر دیتے تھے۔

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھے جانے کی تاریخ نہایت عمدہ کہی ہے جو قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور جو اپنے مضمون کے لحاظ سے نہایت موزوں اور مناسب ہے۔ یہ تاریخ پنڈال میں جلی حروف میں لکھ کر آویزاں کی گئی تھی جو حسب ذیل ہے:

ملت ایں مدرسہ تازہ چوں بنیاد نہاد
کہ در و خلق زہر ناحیتے مجتمع است
قدسیاں از سر الہام بہ شبلی گفتند
سال تاریخ بنا اول بیت وضع است

۱۳۲۹ہجری

شمس العلماء مولانا حالی نے ایک نظم اس موقع کے لیے تحریر فرمائی تھی اور جلسہ میں تشریف آوری کا بھی ارادہ تھا لیکن افسوس کہ جناب ممدوح کی طبیعت یکا یک ناساز ہوگئی اور ارادۂ تشریف آوری ملتوی کرنا پڑا۔ چونکہ یہ نظم بعد میں پہنچی اس لیے ہز آنر کی تشریف آوری کے پروگرام میں داخل نہ ہوسکی اور یہی موقع اس کے پڑھے جانے کا تھا۔ آج کے اخبار میں یہ نظم شائع کی گئی ہے۔

پہلا اجلاس: ۲۹؍اور ۳۰؍نومبر کو ندوہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ ۲۹؍نومبر کو پہلا اجلاس بارہ بجے دن کے شروع ہوا۔ جلسے کے صدر نشین مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے۔ اول قاری حسن آفندی نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ پھر مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے افتتاحی تقریر کی۔ شروع تقریر میں انھوں نے فرمایا کہ اصلی صدر نشین ایسے مذہبی اور اسلامی جلسوں میں خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوتے ہیں مگر چونکہ حضور انور ظاہری طور پر روپوش ہیں اس لیے قوم ایک شخص کو بطور نائب ظاہری کے منتخب کرتی ہے اور اس کو صدارت جلسہ کی خدمت انجام دینی پڑتی ہے۔ چنانچہ آج کے جلسے کے لیے قوم نے اس خدمت کے لیے مجھ کو نامزد کیا ہے لیکن خوب یاد رہے کہ اگر میں بمطابق اصول اسلامی اس خدمت کو انجام دوں تو اس عہدے کے قابل ہوں گا اور اگر کوئی بات اس کے خلاف مجھ سے سرزد ہو تو میں اپنے تئیں اس خدمت کے ناقابل قرار دوں گا۔ اثنائے تقریر میں مولانا نے محمدن ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن حمایت الاسلام، لاہور کی تعریف کی۔ پھر فرمایا ندوہ ان مجلسوں کے بعد قائم ہوا اور وہ غریبوں کی ایک مجلس ہے۔ اس لحاظ سے ندوہ تیسرے درجے پر ہے۔ اگر پہلی دونوں مجلسوں کو ریل کی فرسٹ اور سکنڈ کلاس سے تشبیہ دی جائے تو ندوہ تھرڈ کلاس کے مشابہ ہے، مگر چونکہ اس کلاس میں زیادہ مسافر سوار ہوتے ہیں اس لیے اگر کہا جائے کہ پبلک کی باگ درحقیقت ندوہ کے ہاتھ میں ہے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ پھر گذشتہ اور موجودہ حالت پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ پہلے قوم میں دولت کی بہتات تھی اور اس کی وجہ سے وہ تعیش اور اسراف میں مبتلا تھے اس لیے اس وقت ترک دنیا کے وعظ کی ضرورت تھی اور اس زمانے کے علماء اس طرح کا وعظ کہا کرتے تھے مگر آج کل قوم میں افلاس عالم گیر ہے اور اس سبب سے ہر طرف تباہی اور ادبار کے آثار نمایاں ہیں۔ موجودہ حالت میں علماء کو ترک دنیا کی نصیحت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس بات کی ہدایت کرنی چاہیے کہ مسلمان دنیا کی برکتیں حاصل کریں اور دین کو بھی فراموش نہ کریں۔ آخر میں عام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ آپ کو دنیوی ترقی کے اسباب

سرگرمی سے مہیا کرنے چاہئیں لیکن اگر آپ دنیا کے حصول میں اس قدر منہمک ہو جائیں کہ مسلمان نہ رہیں تو ہماری قوم کو آپ کی ذات سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لیے میں نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دنیا کے ساتھ دین کو ہرگز فراموش نہ کریں۔ ندوہ اسی لیے قائم ہوا ہے کہ دین اور دنیا کے ڈانڈے ملائے اور دین داروں اور دنیاداروں کے گروہوں کو باہم ملا کر ان کو اعتدال پر لے آئے۔

افتتاحی تقریر کے بعد شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے اپنا فارسی ترکیب بند حاضرین کو پڑھ کر سنایا جو انھوں نے اس موقع کے لیے تیار کیا تھا۔ حاضرین نے اس ترکیب بند کو بہت پسند کیا اور اس کے پڑھے جانے کے وقت ہر طرف سے تحسین و آفرین کے نعرے بلند ہوئے۔ یہ ترکیب بند بھی آج کے اخبار میں درج کیا گیا تاکہ جلسے کے حاضرین کی طرح ہمارے اخبار کے ناظرین بھی اس سے لطف اٹھائیں۔

اس کے بعد دارالعلوم ندوہ کی زمین کے عطا کیے جانے اور ۵۰۰ روپیہ ماہوار کی امداد ملنے پر گورنمنٹ کے شکریہ کا ریزولیوشن پیش کیا گیا جو بالاتفاق پاس ہوا۔ پھر جناب بیگم صاحبہ بھاول پور کے شکریہ کا ریزولیوشن پیش ہوا جنھوں نے دارالعلوم کی تعمیر کے لیے پچاس ہزار کا عطیہ مرحمت فرمایا ہے۔ یہ ریزولیوشن بھی بالاتفاق منظور ہوا۔ پھر ایک ریزولیوشن ملک کی موجودہ شورش سے اظہار نفرت کا پیش کیا گیا جس کے محرک مولانا شبلی نعمانی اور خان بہادر مولانا شاہ ابوالخیر صاحب اور مولوی غلام محمد صاحب شملوی تھے۔ مولانا شبلی نے اس ریزولیوشن کی تائید میں کہا کہ یہ امر دریافت کرنے کے لیے کہ زمانہ آئندہ میں گورنمنٹ کے ساتھ مسلمانوں کا برتاؤ کیا ہوگا، ان کے زمانہ ماضی کے حالات پر غور کرنا لازم ہے۔ جناب سرور کائناتؐ کے عہد مبارک میں مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے حبش میں چلے گئے تھے جہاں کا حکمراں عیسائی مذہب کا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو پناہ دی اور ان کے ساتھ نہایت مروت سے پیش آیا۔ محدث طبری نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں کسی غنیم نے حبش پر حملہ کیا۔ مسلمانوں نے اس غنیم کا جی توڑ کر مقابلہ کیا اور والی حبش کی حمایت میں اپنی جان پر کھیل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غنیم کو شکست ہوئی۔ اثنائے جنگ میں تمام مسلمان مسجد میں والی حبش کی فتح کے لیے دعا مانگتے تھے۔ قرن اول کے اس واقعہ کے بعد اور کسی بھی شہادت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کے واسطے رہنمائی کرتا ہے۔ تاہم بعد کی تاریخ سے یہ واقعہ بھی بیان کرنے کے لائق ہے کہ جزیرہ سسلی میں جب کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا ایک عیسائی حکمراں راجر نام کی حکومت قائم ہوئی۔ علامہ ابن جبیر لکھتے ہیں کہ اس جزیرہ

کے مسلمان راجر کے دربار میں محفوظ تھے۔اس کو مسلمانوں پر جو اعتقاد تھا وہ اپنی عیسائی قوم پر نہیں تھا۔چنگیز اور اس کی نسل کے تاتاری حکمراں، جو مسلمان نہیں تھے،ان کے دربار میں بھی مسلمان بڑے عہدوں پر ممتاز تھے اور پوری اطاعت اور وفاداری کے ساتھ ملکی خدمات انجام دیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ زمانہ حال کے مسلمان بھی موجودہ پولیٹکل شورش کے زمانے میں گورنمنٹ کی اطاعت اور وفاداری کے رستے سے ایک انچ بھی نہیں ہٹے۔ندوہ نے اپنے سفیروں کو ہدایت کی ہے کہ جہاں کہیں وہ جائیں،ندوہ کے مقاصد کی اشاعت کے ساتھ وہ اس فرض کو بھی انجام دیں کہ مسلمان گورنمنٹ کے برخلاف ملکی شورش میں شریک ہونے سے باز رکھے جائیں۔مولوی غلام محمد صاحب شملوی سفیر نے کہا کہ میں اس وقت مدراس میں تھا جبکہ بپن چندر پال گورنمنٹ کے برخلاف اسپیچیں دے کر مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھڑکا رہے تھے۔میں نے پوری کوشش کی کہ مسلمان ان دھوکوں میں نہ آئیں اور ایسے جلسوں سے کنارہ کش رہیں۔خدا کا شکر ہے کہ میری کوشش کامیاب ہوئی اور مسلمانوں نے سرِ مو گورنمنٹ کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا اور وہ موجودہ ملکی شورش میں شریک نہیں ہوئے۔یہ ریزولیوشن بالاتفاق پاس کیا گیا۔پھر ایک گھنٹے کے لیے حاضرین کو مہلت دی گئی اور پہلا اجلاس برخاست ہوا۔

**دوسرا اجلاس:** ظہر کی نماز کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا۔لوگوں نے اصرار کیا کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اپنا ترکیب بند دوبارہ پڑھ کر سنائیں چنانچہ انہوں نے لوگوں کی خواہش کو پورا کیا اور دوبارہ نظم پڑھ کر سنائی۔بہت سے لوگوں نے ان کی مطبوعہ نظم ایک ایک روپیہ کو خرید کی مگر جو لوگ ایک روپیہ دینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے ان سے صرف آٹھ آنے اور بعض سے چار آنے وصول ہوئے۔

اس کے بعد دارالعلوم کے چار طالب علم پیش کیے گئے جن کے نام حسب ذیل ہیں۔حافظ محمد یوسف،حافظ عبدالصمد،عبدالسلام،قمرالدین۔حاضرین اجلاس سے خواہش کی گئی کہ ان کی عربی زبان دانی کا امتحان کریں۔چنانچہ محمد حسن صاحب مقبہ،رئیس ممبئی نے ہمارے اخبار کے نصف کالم کے برابر ایک عبارت اردو زبان میں ان کو لکھوائی اور عربی زبان میں ترجمہ کرنے کی ان کو فرمائش کی۔چاروں طلبہ نے یکے بعد دیگرے اس عبارت کا ترجمہ عربی زبان میں کیا جو آج کل کی عصری کتابی زبان میں تھا۔اس پر ہر طرف سے تحسین آفرین کی آوازیں آئیں۔ہر طالب علم نے اپنی عبارت خود پڑھ کر سنائی۔پھر حافظ عبدالصمد نے اسلامی حقوق پر ایک نہایت عمدہ اور برجستہ تقریر عربی زبان میں کی جس کو سن کر سب لوگ

دنگ رہ گئے۔اس تقریر میں ایسی شستہ ترکیبیں اور پاکیزہ محاورے استعمال کیے گئے تھے جیسے آج کل کے مصری اخبارات میں دیکھے جاتے ہیں۔مولانا شاہ سلیمان صاحب نے طالب علم مذکور کو دس روپیہ انعام دیا مگر اس نے یہ روپیہ ندوہ کو نذر کر دیا۔شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے جلسے کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ نمونہ جو دیکھا گیا ہے دار العلوم ندوہ کی تعلیم کا تھا اور یہ نمونہ اس تربیت کا ہے جو اس درس گاہ میں دی جاتی ہے۔

اس موقع پر متعدد اشخاص نے دار العلوم کے لیے سالانہ چندہ کا وعدہ کیا اور بعض نے دارالاقامہ کے لیے ایک ایک کمرہ بنوا دینے کا اقرار کیا۔آج کے اخبار میں ہم تے ندوہ کی خبروں کے ذیل میں ان میں سے بعض وعدوں کا ذکر کیا ہے۔اس کاروائی کے بعد چار مندرجہ ذیل طلبہ کو عالمیت کی سند صدر نشین جلسہ نے اپنے ہاتھ سے عطا کی: محمد یعسوب بہاری، محمد شبلی اعظم گڑھی، سید محمد فاروق طالب علم رائے بریلی، محمد جواد علی خاں طالب علم محمد پور، ضلع بارہ بنکی۔

اب وقت تھا کہ وقف اولاد کا معرکۃ الآراء مسئلہ علماء کے سامنے پیش کیا جائے۔چنانچہ مولانا سید سلیمان شاہ صاحب نے اس کے متعلق تمہیدی تقریر شروع کی اور اس میں اس مسئلہ کو پیش کرنے کی ضرورت مفصل طور پر بیان کی اور مسلمانوں کی جائدادوں کی کی موجودہ حالت کی تصویر کھینچ کر دکھائی اور بتایا کہ وہ کس طرح روز بروز برباد ہوتی جا رہی ہیں۔مولانا کی یہ تقریر ایسی مؤثر اور درد انگیز تھی کہ حاضرین اجلاس کے دلوں پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوا۔مگر اس تقریر کے ختم ہونے پر نماز عصر کا وقت آ گیا تھا اس لیے اجلاس برخاست کیا گیا اور وقف اولاد کی بحث دوسرے روز کے لیے ملتوی کی گئی۔

سائنس پر لکچر: نماز مغرب کے بعد سائنس پر لکچر ہونا قرار پایا تھا۔وقت سے پہلے سارا پنڈال لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ہمارے کالج کے نامور پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الدین نے اول ہیئت جدید پر تقریر شروع کی اور فانوس جادو کی مدد سے نظام بطلیموس اور نظام فیثاغورثی کا فرق نمایاں کیا۔پھر دو تین تجربے کیمیائے جدید کے دکھائے۔فیروز الدین صاحب بی۔ایس۔سی نے برقیات کے متعلق مختصر تقریر کی اور اس کے متعلق چند تجربات دکھائے۔یہ تجربے علماء اور طلبہ اور عام حاضرین کو بہت زیادہ دلچسپ معلوم ہوئے۔شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کا شکریہ ادا کہ انہوں نے بلا کسی تحریک کے ان علمی تجربوں کو دکھانے کے لیے علی گڑھ سے لکھنؤ تک آنے کی تکلیف اٹھائی اور سائنس کے آلات اپنے ساتھ لائے۔پھر اس امر کا بھی شکریہ ادا کیا کہ اگر دار العلوم کے طلبہ کبھی مدرسۃ العلوم میں

علوم طبیعہ کی عملی تعلیم کے لیے جائیں گے تو ڈاکٹر صاحب ان کو عملی تجربات دکھانے اور سمجھانے میں دریغ نہیں کریں گے۔ یہ دلچسپ علمی نظارہ پورے دو گھنٹے تک قائم رہا پھر حاضرین جلسہ رخصت ہو گئے۔

۳۰ر نومبر کو اجلاس سے پہلے دارالعلوم کے طلبہ نے مدرسۃ العلوم کے ان طلبہ کو جو وہاں موجود تھے، ایک پرلطف ٹی پارٹی دی۔ طرفین سے باہمی محبت اور ارتباط کی ضرورت پر چند دلچسپ تقریریں کی گئیں۔ جس طرح ارکان مدرسۃ العلوم نے ارکان دارالعلوم کی دعوت قبول کر کے ندوہ کے جلسہ میں شرکت کی تھی اور ہمدردانہ تعلقات کا ثبوت دیا تھا، اسی طرح دارالعلوم کے طلبہ نے مدرسۃ العلوم کے طلبہ کے ساتھ برادرانہ تعلقات کا اظہار کیا اور دونوں آپس میں نہایت گرم جوشی اور خلوص سے ملے۔ قدیم اور جدید گروہ کے بوڑھوں اور نوجوانوں کا دوستانہ طور پر ملنا ایسا دل خوش کن واقعہ ہے کہ اس سے قوم کی آئندہ مجموعی ترقی کی نسبت بے تکلیف پیش گوئی ہوسکتی ہے۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ آئندہ بھی دونوں گروہوں کو ایسے بہت سے مواقع ملیں کہ وہ باہم مل کر اظہار ارتباط اور تبادلہ خیالات کرسکیں۔

تیسرا اجلاس: پونے بارہ بجے کے قریب ندوہ کا تیسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس کی کرسی صدارت پر مولانا شاہ ابوالخیر صاحب غازی پوری جلوہ افروز ہوئے۔ سب سے پہلے قاری حسن آفندی نے دل گداز اور پرجوش الحان سے قرآن مجید کا ایک رکوع پڑھا۔ پھر نواب عظمت علی خان صاحب، رئیس کرنال، کے اس وقف کی نسبت شکریہ کا رزولیوشن پیش کیا گیا جس کے ایک روپیہ میں ایک آنہ نواب ممدوح نے ندوہ کے لیے وقف کیا ہے۔ یہ رزولیوشن بغیر کسی اختلاف کے پاس ہوا۔

اس کے بعد وقف علی الاولاد کی تحریک پیش کی گئی۔ اس کے محرک شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی تھے۔ انھوں نے نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن مجید اور احادیث اور فقہی روایات سے وقف علی الاولاد کے شرعی جواز پر بحث کی۔ پھر تحریک کی کہ اس غرض کے لیے ایک انجمن بنائی جائے۔ اس انجمن کا فرض ہوگا کہ وہ ہندوستان کے مختلف طبقوں کے مسلمان علماء سے اس مسئلے کے متعلق استفتاء کرے اور ایک عرض داشت تیار کرے۔ پھر انجمن کی مدد سے ہر حصہ ہندوستان کے مسلمانوں سے اس عرض داشت پر دستخط کرائے۔ پھر اس کے بعد تمام مسلمانانِ ہند کی طرف سے ایک بیانی ارسالیہ حضور وائسرائے کی خدمت میں بھیجا جائے تاکہ وہ اس عرض داشت کو پیش کرے اور درخواست کرے کہ امپیریل گورنمنٹ اس باب میں مسلمانوں کے لیے ایک قانون وضع کردے تاکہ مسلمانوں کی جائدادیں تباہ ہونے سے محفوظ رہیں۔

آخر تقریر میں فاضل اسپیکر نے کہا کہ پولٹیکل پہلو سے یہ مسئلہ گورنمنٹ کے سامنے پیش نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس مسئلے کو مذہبی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے اور اسی میں کامیابی کی امید ہے، کیوں کہ انگریزوں کی قوم اس مسئلے کے برخلاف کیسا ہی یقین رکھتی ہو مگر جب گورنمنٹ کو یہ امر واضح ہوجائے گا کہ یہ مسئلہ کل مسلمانوں کا ایک مذہبی مسلمہ ہے تو اس کے لیے ایک نیا قانون وضع کرنے میں وہ کبھی دریغ نہیں کرے گی۔ نظیر کے طور پر محرک نے ایک قانون کا حوالہ دیا جس کو ہندوؤں نے اسی بنا پر جدوجہد کرکے پیش گاہ گورنمنٹ میں پاس کرایا ہے۔ مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی نے اس تحریک کی تائید کی اور کہا کہ ہماری قوم مثل ایک مریض کے ہے جس کا دماغ، قلب اور معدہ مبتلائے مرض ہیں۔ مدرسۃ العلوم عقلی تعلیم دیتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوم کے دماغی علاج کے درپے ہے۔ دارالعلوم نے مذہبی تعلیم پر کمر باندھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قوم کے قلبی امراض کا علاج کرنا چاہتا ہے مگر دونوں سے پہلے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ قوم کے معدہ کو درست رکھا جائے تاکہ اس کے ذریعہ قلب اور دماغ کو غذا پہنچ سکے ورنہ دماغ اور قلب کا علاج کرنا محض بے کار ہوگا۔ قوم کے معدہ کو درست کرنے سے میری مراد زمین داریوں کی حفاظت ہے۔ جب جائدادوں کے تباہ ہونے سے مسلمانوں میں افلاس عام طور سے پھیل گیا ہے تو ہماری قوم ترقی اور کامیابی کا کوئی درجہ حاصل نہیں کرسکتی۔ پس میں وقف علی الاولاد کی تحریک کی تائید کرتا ہوں کیوں کہ یہ وہ ذریعہ ہے جس سے مسلمانوں کی جائدادیں محفوظ ہوجائیں گے۔ حاضرین اجلاس میں سے کسی نے اس تحریک سے اختلاف نہیں کیا۔ اس لیے پورے اجلاس کے اتفاق رائے سے یہ تحریک منظور ہوگئی۔

اس اجلاس میں جو وقت باقی تھا اس میں مولوی احمد علی صاحب میرٹھی نے فضائل و برکات اسلام پر وعظ کیا۔ مگر یہ وعظ ایسا تھا کہ اس سے دارالعلوم کے قائم کرنے اور اس سے روشن خیال علماء پیدا کرنے کی ضرورت بین طور پر ثابت ہوگئی۔

**چوتھا اجلاس:** ظہر کی نماز کے بعد چوتھا اجلاس شروع ہوا۔ مولوی عبدالودود صاحب سند یافتہ دارالعلوم ندوہ نے ڈیک (ریاست بھرت پور) کی انجمن اسلامیہ کی نسبت، جس کو خود انہوں نے قائم کیا ہے، یہ تحریک پیش کی کہ ندوہ اس کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لینا قبول کرے۔ مولوی غلام محمد صاحب ہوشیارپوری اور سید سلیمان صاحب نے اس تحریک کی تائید کی اور ندوہ نے اس کو بالاتفاق منظور کرلیا۔

اس کے بعد بعد مسٹر ابوالخیر نے محمدن ینگ مین ایسوسی ایشن (لکھنؤ) کی نسبت یہ تحریک

پیش کی کہ ندوہ اس انجمن کو بھی اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لینا منظور کرے تاکہ اس انجمن کے نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ندوہ کے علماء سے فیض تربیت و ہدایت حاصل کرنے کا موقع ملے اور وہ اپنے عمدہ مقاصد یعنی اخلاقی اصلاح اور اشاعت اسلام میں کامیاب ہوسکیں۔ منشی احتشام علی صاحب کی رائے سے اس تحریک کی نسبت یہ قرار پایا کہ انجمن مذکور اپنے قواعد وضوابط ارکان انتظامیہ کے جلسے میں پیش کرے تاکہ ان پر غور کرنے کے بعد اس انجمن کو وہ اپنی نگرانی میں لینا مناسب وجوہ سے منظور کرسکے۔

تحریک مذکور کا فیصلہ ہونے کے بعد شمس العلماء شبلی نعمانی اپنی کرسی سے اٹھے اور انہوں نے دارالعلوم کے بورڈنگ ہوس کی تعمیر کے لیے قوم سے اپیل کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں تقریر شروع کی:

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

حاضرین اجلاس نے شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی اس تقریر کو نہایت پسند کیا اور اس تحریک کے ساتھ اتفاق رائے کا اظہار کیا۔

اس کے بعد ندوہ کی سالانہ روداد پڑھی گئی اور معاونین ندوہ کا شکریہ ادا کیا گیا۔ نماز مغرب کے بعد مولوی نظام الدین صاحب جھجھری کا وعظ ہونے والا تھا اور اسی پر جلسے کا اختتام قرار پایا تھا۔

---

حواشی

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی، حیت شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۵۹۳۔ (۲) مکاتیب شبلی، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء، ج ۲، ص ۱۵۸۔ (۳) حیات شبلی، ص ۴۶۴۔ (۴) علامہ شبلی، الندوہ، ج ۵، رمضان ۱۳۲۶ھ/ اکتوبر ۱۹۰۸ء؛ نیز دیکھیے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۱/اکتوبر ۱۹۰۸ء، ص ۴؛ مقالات شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۰ء، ج ۸، ص ۸۰۔۸۱۔ (۵) مصدر سابق، ص ۴۶۹۔ (۶) مصدر سابق، ص ۴۶۵۔۴۰۷۔ (۷) شمس تبریز خاں، تاریخ ندوۃ العلماء، دفتر نظامت، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ج ۲، ص ۵۳۔ (۸) ترکیب بند کے لیے دیکھیے کلیات شبلی (فارسی)، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، بدون تاریخ، ص ۱۰۱/۱۔ ۴/۱۰، اس کا مطلع ہے:

اے کہ نیرنگ سرا پردہ عالم دیدی جاہ کیخسرو و فرّ حشم جم دیدی

اس موقع پر علامہ شبلی نے جو تقریر کی تھی اس کے لیے دیکھیے خطبات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء، ص ۸۳۔۸۸۔ (۹) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲/دسمبر ۱۹۰۸ء، ص ۱۔۲۔

# معارف کی ڈاک

## مکتوب بہار

کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج،
پوسٹ بسوریا، وایا لوریا،
مغربی چمپارن، بہار
۲۱/۲/۲۰۱۹ء

محترمی زید مجدکم

معارف جنوری ۲۰۱۹ء کا شمارہ ملا۔ شذرات، مقالات اور مولانا اسرارالحق قاسمی پر مضمون سب معلومات افزا ہیں۔ یاد آیا کہ مولانا کلیم صفات اصلاحی نے اپنی تالیف ''دارالمصنّفین کے سو سال'' میں مولانا اسرارالحق قاسمی کے تعارف میں لکھا ہے:

> ''(مولانا اسرارالحق قاسمی) مشہور مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی کی خدمت میں بھی رہے۔ رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کا جذبہ انہیں کی صحبتوں کا رہین منت ہے''۔
> (دارالمصنّفین کے سو سال، ص ۳۳۵)

یہ خیال محل نظر ہے، مولانا اسرارالحق قاسمی ۱۵/فروری ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے اور مولانا حسرت موہانی نے مئی ۱۹۵۱ء میں انتقال کیا۔ اس وقت قاسمی صاحب کی عمر ۸/سال کے قریب تھی۔ یعنی وہ طفل مکتب تھے، اس عمر میں مولانا حسرت موہانی سے ان کا فیض یاب ہونا تو الگ بات ہے، ان سے ان کی ملاقات اور ان کی شخصیت سے واقفیت بھی بعید از خیال ہے۔

ڈاکٹر سید ارشد اسلم کی تالیف ''سید سلیمان ندویؒ کا ترک وطن: اسباب وحقائق'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ابوعلی اثری صاحب مرحوم کے حوالہ سے آپ نے تحریر فرمایا ہے:

> ''جب قاری طیب صاحب کو مولانا مدنی پاکستان سے ہندوستان واپس لے آئے تو کیا دارالمصنّفین سے بھی کوئی ایسی سنجیدہ کوشش کی گئی''۔ (معارف جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۷۹)

اس سلسلے میں ناچیز یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کو پاکستان سے ہندوستان لانے میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی کوششوں کا کوئی دخل نہیں ہے۔

مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے اپنی تصنیف نقوش خاطر (قلمی خاکوں کا مجموعہ) میں مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے حوالے سے مولانا قاری محمد طیب کو پاکستان سے ہندوستان لانے کے بارے میں جو تفصیل دی ہے اس کا ماحصل یہ ہے:

''ایک دن نئی دہلی میں منعقدہ مجلس مشاورت کی میٹنگ سے فراغت کے بعد مولانا محمد سالم قاسمی اوکھلا آرہے تھے، اتفاق سے میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ گفتگو کے دوران مولانا قاری محمد طیب صاحب کے پاکستان جانے اور پھر وہاں سے ان کے واپس آنے کا ذکر چھڑ گیا تو مولانا سالم قاسمی صاحب نے فرمایا:

والد صاحب کے پاکستان چلے جانے سے ہم لوگ غیر مطمئن رہنے لگے۔ پاکستان کے سیاسی حالات کے اطمینان بخش نہ ہونے کی وجہ سے والد صاحب کا جی وہاں نہیں لگتا تھا، پاکستان کے ایک مشہور تاجر فیروزی صاحب کو والد صاحب سے والہانہ عقیدت تھی، انہوں نے والد صاحب کا پاسپورٹ چھپا دیا کہ وہ ہندوستان واپس نہ جاسکیں۔

ایک روز (فون پر) والد صاحب سے میری بات ہوئی تو انہوں نے ہندوستان آنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بلا تاخیر دیوبند سے دہلی گیا اور سیدھے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (ممبر پارلیامنٹ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ابا جی کی خواہش اور اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور ابا جی کے پاسپورٹ غائب ہونے کا بھی ذکر کیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے میری باتوں کو غور سے سنا اور فرمایا کہ کل ہم لوگ مولانا آزاد سے مل کر حضرت قاری صاحب کو ہندوستان لانے کے بارے میں بات کریں گے۔

دوسرے دن صبح کو ہم مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ساتھ مولانا آزاد کی کوٹھی پر گئے، مولانا آزاد کو مولانا حفظ الرحمٰن نے قاری صاحب کے بارے میں پوری تفصیل بتائی۔ مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں پنڈت جواہر لعل نہرو سے بات کروں گا، قاری صاحب کو ہندوستان لانے کا انتظام ہوجائے گا۔

مولانا آزاد کی گفتگو سے مطمئن ہوکر ہم لوگ واپس آئے۔ میں نے اس کی اطلاع والد صاحب کو کردی، جب کئی ہفتے گزر گئے اور والد صاحب کے پاس کوئی اطلاع نہیں پہنچی تو میں دوسری بار دیوبند سے دہلی پہنچا اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے مل کر ان کو صورت حال کی اطلاع کی، ان

کے ساتھ دوسری بار مولانا آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مولانا آزاد سے کہا کہ حضرت قاری صاحب کو ہندوستان لانے کے سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے سکریٹری سے پنڈت جی سے بات کرانے کے لیے کہا، مولانا آزاد نے پنڈت جی سے کچھ برہمی کے لہجے میں کہا کہ تین مہینے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، اب تک حکومت کی طرف سے مولانا محمد طیب صاحب کو ہندوستان لانے کے سلسلے میں کسی قسم کی کارروائی کی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے۔

مولانا آزاد کے اشارے پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے ہمراہ ہم پنڈت جواہر لعل نہرو سے بھی ملے۔ پنڈت جی نے اپنے سکریٹری سے پاکستان میں ہندوستان کے ہائی کمشنر سے بات کرانے کے لیے کہا۔ پنڈت جی نے فون پر ہندوستان کے ہائی کمشنر سے کہا:

کیا بات ہے کہ اب تک مولانا محمد طیب صاحب کو ہندوستان لانے کا انتظام نہ ہوسکا۔ میں کوئی عذر نہیں سن سکتا ہوں، میں ان کو اس ہفتے میں ہندوستان میں دیکھنا چاہتا ہوں۔

پھر پنڈت جی نے فون رکھ دیا اور فرمایا کہ قاری محمد طیب صاحب جلد ہی ہندوستان آجائیں گے، چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر والد صاحب ہندوستان واپس آگئے تو کچھ لوگوں نے اپنا کارنامہ بتانا شروع کردیا، حقیقت یہ ہے کہ حضرت والد صاحب کو ہندوستان لانے میں صرف مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی کوششوں کا دخل رہا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب مہتمم صاحب ہندوستان آگئے تو ایک حلقہ نے اسے پسند نہیں کیا اور ان کے خلاف خطوط لکھنے شروع کیے"۔ (نقوش خاطر ص ۲۱۷ تا ۲۱۹)

مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب نے لکھا ہے:

مرحوم سید مظفر حسین برنی صاحب گورنر ہریانہ، ہندوستان کے آئی ایس آفیسر رہے ہیں، جو ہوم منسٹری میں تھے، ان کا بیان ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد حضرت قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے خلاف اتنے خطوط آتے تھے کہ اگر ہندوستان جمہوری ملک نہ ہوتا تو حضرت قاری صاحب کبھی جیل سے باہر نہیں آسکتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۱۹)

جناب وارث ریاضی

## ادبیات

# غزلیں

### جناب جمیل مانوی*

دعائے خیر ابھی راہِ اعتبار میں ہے
کسی کے ہاتھ اٹھانے کے انتظار میں ہے

ازل بھی تیرے غلاموں میں ایک ادنیٰ غلام
ابد بھی سجدہ کناں تیرے اقتدار میں ہے

اسی سے گردش رنگ چمن اسی سے بہار
وہی خزاں میں وہی دامن بہار میں ہے

اگر نگاہ کو ہے رخ سے کھیلنے کی طلب
تو دل بھی تیرے تکلم کے انتظار میں ہے

عزیز تر ہے مجھے جان و دل سے بھی ترا عشق
یہ اور بات کہ دل تیرے اختیار میں ہے

مجھے تلاش خود اپنے ہی نقش پا کی ہے
مجھے خبر ہے کہ منزل مرے غبار میں ہے

بجھے دِیوں کا دھواں ادھ جلے گھروں کا غبار
یہ اہتمام بھی اب کے برس بہار میں ہے

زمیں سے بڑھ کے فضاؤں میں ہے فساد جمیلؔ
ہوس یہ بھول گئی موت انتظار میں ہے

---

### جناب وارث ریاضی**

بچائے خدا ایسی دانش وری سے
کہ نفرت بڑھے علم کی خودسری سے

عجیب کیفیت ہے دلِ خود نگر کی
کہ الجھن ہے غم سے نہ تسکین خوشی سے

علاج غم آرزو ہے یہ کیسا؟
مرض بڑھ گیا اور چارہ گری سے

رضا سے تری ، ہم سے راضی تھی دنیا
خدا ئی خفا ہے تری برہمی سے

زمانے پہ کی ہم نے صدیوں حکومت
محبت سے ، اخلاق سے ، آگہی سے

معلق فضاؤں میں ہیں مہر و انجم
خدائے دو عالم کی کاری گری سے

کبھی وہ نہ محتاج ہوگا جہاں میں
لیا کام جس نے میانہ روی سے

یہ معلوم کچھ بھی نہیں ہے کہ وارثؔ
کہاں آ گئے ہم رہِ بے خودی سے؟

---

* سہارن پور۔

** کاشانۂ ادب، سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار۔

# مطبوعات جدیدہ

**بیدل وغالب:** از ڈاکٹر سید احسن الظفر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۸۴، قیمت: ۵۰۰/روپے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی نمبر۔۲۔

مرزا عبدالقادر بیدل اور غالب کتنے پاس لیکن کتنے دور ہیں؟ بظاہر یہ سوال جتنا آسان ہے، ماہرین غالبیات نے تحقیق و تفہیم کی دنیا میں اسے اتنا ہی مشکل بنادیا، اتنا تو ایک عامی غالب شناس سمجھتا ہے کہ بیدل کے تعارف کا حق صرف اور صرف غالب نے ادا کیا، خدا جانے کتنے مقامات، جہان غالب میں ایسے آتے ہیں جہاں حیرت، استعجاب، قبول، اعتراف، تحسین کے معانی اپنی بستیاں آباد کرتے ہیں وہیں ایسے ناہموار راستے بھی ہیں جہاں رد و استغنا، بے زاری بلکہ بیدل آزاری سے سابقہ پڑتا ہے، غالب کے مزاج کی طرح بیدل کے سلسلہ میں ان کے اس رویہ نے شعروشاعرفہمی میں ضرور ایسی بحث کی بنیاد ڈالی جس کی معنویت وافادیت کی لطافت ولذت کم نہیں ہونے والی، اس کتاب کے فاضل مصنف پہلے بھی بیدل کا غائر مطالعہ وتجزیہ پیش کر چکے ہیں، ان کو حق تھا کہ وہ اس طرز بیدل کا پتہ لگاتے جس سے ریختہ کو سنوارنا، غالب کے لیے قیامت ہوگیا تھا۔ بیدل کی تقلید اگر ہوئی تو کہاں اور کیسے اور غالب نے اس طوق تقلید سے آزادی حاصل کی تو کیوں؟ بڑی صفائی سے کہہ دیا گیا کہ غالب کے نزدیک آرزو سے زندگی قائم ہے، بیدل اس کے برعکس ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ آرزو سے انسان دام بلا میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ ایک طرف یہ تلقین کہ

ع آرزو از سینہ بیروں کن........

دوسری جانب یہ نعرہ کہ ع اگر شراب نہیں، انتظار ساغر کھینچ

فاضل مصنف نے چند سطروں میں بتادیا کہ غالب نے بیدل کا اثر تین طرح سے قبول کیا یعنی لفظی ترجمہ، خیال کی ترجمانی یا پھر خیال ہی سے انحراف، مگر اس کی تفصیل جس طرح کی گئی وہ مطالعہ ہی نہیں تجزیہ کی قوت کی بہترین مثال ہے۔ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، ظاہر ہے چہار ستون کی عمارت مستحکم ہی ہوتی ہے۔

**جہات سرسید:** از ڈاکٹر شمس بدایونی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۰، قیمت: ۲۵۰/روپے، پتہ: براؤن بکس، بالمقابل بلائنڈ اسکول قلعہ روڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

سرسید کے دوسوسالہ جشن ولادت کی برکتوں کا اگر شمار کیا جائے تو پانچ مقالات پر مشتمل یہ کتاب بھی منتخب قطار میں نظر آئے گی، تنوع اور انفرادیت نے سرسید کے مرکزی موضوع کو واقعی ایسی جہات عطا

کردیں کہ پڑھنے والے کو جدت اور تازگی دونوں کا خوش گوار احساس ہوتا ہے، سرسید کے خطابات، مکاتیب سرسید کا قلمی نسخہ، کتاب فقرات، سرسید کے کم یاب مجموعہ ہائے خطوط اور سب سے بڑھ کر تجاویز سرسید اور تاریخ رموز واوقاف ہر مضمون مسرت کے ساتھ حیرت بخشتا جاتا ہے۔ آج املا اور اس کے آداب واشارات اور اس کے لیے علامات کے بارے میں گفتگو، گویا علمی موضوعات سے باہر کی چیز ہے، چند محققین نے ضرور محنت کی، کچھ نئی باتیں بھی سامنے آئیں، لیکن عجب معاملہ ہے کہ قریب ڈیڑھ سو برس پہلے سرسید نے جہاں ایک نئے سادہ عام فہم، شگفتہ نہ سہی مگر شستہ اسلوب سے اردو نثر کو روشناس کیا وہیں انہوں نے علامات قرأت پر اظہار خیال کر کے اس یقین کو تقویت بخشی کہ اردو کو سائنٹفک بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے علامات و رموز کے مسئلہ پر غور کیا جاسکتا ہے اور پھر ایسی تجویزیں پیش کیں جو قبول ہو کر یوں رائج ہوئیں کہ اردو املا کا جزو لاینفک ہوگئیں اور لطف یہ کہ کسی کے ذہن میں یہ نہ آیا کہ کب اور کس طرح یہ اردو تحریر کا حصہ ہوگئیں۔ کتاب میں اس پورے مضمون کو جس محنت و تحقیق سے پیش کیا گیا ہے اس سے ایک بظاہر خشک موضوع بھی بڑا دلچسپ بن گیا، سرسید کی اولیت پر ایمان لا کر ان سے پہلے اور بعد یعنی فورٹ ولیم کالج، گل کرسٹ، ڈنکن فوربس، امام بخش صہبائی، مرزا محمد علی، قلق میرٹھی، شیخ غلام محمد، سید ممتاز علی، علامہ شبلی، مولانا آزاد، عبدالستار صدیقی، عبدالحق، رشید حسن خاں اور گیان چند تک تحقیق و جستجو کی ایک موج ہے، جس کی روانی بس دیکھنے کے لائق ہے، فاضل مصنف اردو تنقید و تحقیق کی نئی نسل میں نیک نامی رکھتے ہیں، بدایوں غالب شبلی کی تثلیث پر عقیدہ رکھتے ہیں، لیکن سرسید پر اور مضامین نہ بھی ہوتے تو یہ علامات و رموز والا مضمون ہی ان کو مثلث کو مربع میں بدلنے کا سہرا ان کے سر باندھ دیتا، انہوں نے پیش گفتار کا آغاز ہی اس جملہ سے کیا کہ سرسید کا مطالعہ، ان کے عہد کے مسلمانوں کے اجتماعی شعور کا مطالعہ ہے، واقعہ بھی یہی ہے کہ سرسید اپنے عہد میں جس دوراہے یا چوراہے پر کھڑے ہو کر اپنے وجود اور اپنی جہات کا اعلان قولاً وفعلاً کر رہے تھے، ان کے حدود وثغور کو دیکھنا آسان نہیں، سیاست، حکومت، مذہب، تہذیب، تمدن، زبان، ماحول، افکار یعنی ایک قیامت کا عالم، قدم قدم پر اقرار و انکار اور توافق و اضداد کا عجب منظر، ایسے میں یہ کہنا کہ شخص واحد کا مطالعہ، ایک قوم کے اجتماعی شعور کا مطالعہ ہے، یہ خود کہنے والے کے بارے میں تاثر دیتا ہے کہ محض تحقیق ہی نہیں اس کے دامن میں فکر و تصور کی دولت بھی ہے اور پیش کرنے کا سلیقہ بھی کہ "سرسید میرے ممدوح تو رہے لیکن غالب و شبلی کی طرح کبھی موضوع نہیں بن سکے"، لیکن ان پانچ مقالوں میں انہوں نے سرسید شناسی کی کامیاب راہ یہ کہہ کر ضرور روشن کردی کہ سرسید کا علمی سرمایہ ہمارا تاریخی ورثہ ہے جس کی تفہیم و حفاظت سب پر لازم ہے۔ انہوں نے شروع

میں چند تجویزیں بھی پیش کی ہیں جیسے سرسید کی حیات میں ان کی مطبوعہ کتابوں کے عکسی ایڈیشن مع مقدمہ چھپنے چاہیں، ان کے متنی ایڈیشن مرتب کیے جائیں، سرسید کے مضامین کی ایسی فہرست شائع کی جائے جس سے الحاقی و مشتبہ مضامین الگ کیے جاسکیں، ان کے خطوط کے مجموعوں کو کلیات کی شکل دی جائے وغیرہ وغیرہ، جناب اصغر عباس اور پروفیسر شافع قدوائی جیسے سرسید شناسوں کی تحریریں بھی کتاب کی وقعت میں اضافہ کا سبب ہیں، دونوں اس نقطہ پر اشتراک فکر رکھتے ہیں کہ سرسید کی زندگی کا ہر گوشہ، روشنی کا مخزن ہے اور یہ کہ چونکہ سرسید صاحب خیر کثیر تھے اس لیے سرسید فہمی کی ایک نئی روایت کی آبیاری ضروری ہے اور یہ کتاب اسی کوشش کا ایک حصہ ہے۔

**آفتاب رسالتؐ حصار جبر میں، شعب ابی طالب:** از ڈاکٹر شاہد بدر فلاحی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۶۰، قیمت: ۱۲۵؍ روپے، پتہ: شعور حق، جی، ایف، ایم۔ ۲۱/۶۰۷، نزد خلیل اللہ مسجد، بٹلا ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵۔

رسول اکرمؐ کی حیات طیبہ کا ہر عنوان انسانیت کے نام، عبادت، اطاعت، جاں فروشی، عزم، ایثار، قربانی، کامرانی اور مقصود اصلی یعنی رضائے رب کے حصول سے عبارت ہے۔ ایسا ہی ایک عنوان شعب ابی طالب کے نام سے ہے، محصوری، مجبوری، بے بسی، اجتماعی تعذیب، معاشرتی تعطل اور یہ سب محض اس لیے کہ باطل کے صنم خانوں میں حق کی صدا لگائی کیوں گئی۔ مسلسل تین سال تک ایک گھاٹی میں بھوکے پیاسے رہنا اور اس سے بڑھ کر بچوں، عورتوں اور بیماروں کو خاردار جھاڑیوں کے پتوں کو نگلتے دیکھنا، خشک چمڑے کو سفوف بنا کر اس پر گذارہ کرنا نبی کریمؐ کی کلی زندگی کی دہشت ناکیوں کی عجیب داستان ہے۔ سیرت نگاروں نے عموماً اس واقعہ کا ذکر کیا لیکن ڈاکٹر شاہد بدر کا یہ احساس ایسا نامناسب نہیں کہ ہمارے سیرت نگار تاریخ کے اس نہایت دردناک واقعہ سے سرسری گزر گئے یہی نہیں کچھ لوگوں نے نفس واقعہ پر گومگو کی حالت طاری کرلی۔ ڈاکٹر صاحب کو چونکہ زندانی فضاؤں میں زندہ رہ جانے کی مشق کرائی گئی اور جسم و جاں کو چھلنی کیے جانے کے تجربوں سے گزارا گیا اس لیے بجا طور پر ان ہی کے لیے زیب تھا کہ وہ حصار جبر میں آفتاب رسالت کی کرنوں کی حدت و حرارت کو شمار کرتے، ان کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی خون دل سے لکھی گئی ہے اور مقصد یہی ہے کہ ملت کو موجودہ جبر کے حصاروں سے آزاد ہونے کا ہنر آئے اور ہمت بھی۔

ع۔ص

# رسید کتب موصولہ

**اردو میں مابعد جدید تنقید:** ڈاکٹر الطاف انجم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔
قیمت: ۵۰۰/روپے

**ترجمان القرآن الکریم و تفہیم القرآن العظیم:** مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ترتیب و تدوین احمد ابوسعید، حافظ عبداللطیف اثری، اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ قیمت ہدیہ: ۱۰۰/روپے

**حضرات مغیرہؓ و عثمانؓ پر اتہام ایک جائزہ:** انیس احمد، مہتاب بک ڈپو، یک منارہ مسجد، تکیہ اعظم گڑھ۔
قیمت درج نہیں

**سوانح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ:** سید محمود حسن حسنی ندوی، مکتبہ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ۔
قیمت: ۳۵۰/روپے

**عنایت نامے (مشاہیر کے خطوط):** پروفیسر مقصود احمد، ۲۰۳ شفا کامپلکس، ٹنڈالجا روڈ، بڑودہ گجرات۔
قیمت: ۴۰۰/روپے

**عوامی مرثیے کی روایت:** لئیق رضوی، 3B/96، اراولی سکٹر ۳۴، نوئیڈا یوپی۔
قیمت: ۲۵۰/روپے

**قرآن کی ترتیب نزولی:** مولانا سید سلمان حسینی ندوی، مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ۔
قیمت: ۶۰۰/روپے

**محفل قرآن (جلد چہارم):** مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، الفرقان بک ڈپو ۱۱۴/۳۱، نظیر آباد، لکھنؤ۔
قیمت: ۳۵۰/روپے

**نقد و نظر (جلد دوم):** مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ، ترتیب مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ، دفتر ختم نبوت پرانی نمائش، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔ قیمت درج نہیں

**نیاز نامہ (نیاز جیراج پوری حیات و جہات):** صالحہ صدیقی، راعی بک ڈپو، الہ آباد۔
قیمت: ۳۰۰/روپے

# تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

| | | | |
|---|---|---|---|
| سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن) | 2000/- | موازنہ انیس و دبیر | 250/- |
| سیرۃ النبیؐ | | اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر | 100/- |
| (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں) | 2200/- | سفر نامہ روم و مصر و شام | 200/- |
| علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی | | کلیات شبلی (اردو) | 220/- |
| مقدمہ سیرۃ النبیؐ | 30/- | کلیات شبلی (فارسی) | 45/- |
| الفاروق | 300/- | مقالات شبلی اول (مذہبی) | 170/- |
| الغزالی | 200/- | مرتبہ: سید سلیمان ندوی | |
| المامون | 175/- | مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃 | 70/- |
| سیرۃ النعمان | 300/- | مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃 | 80/- |
| سوانح مولانا روم | 220/- | مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃 | 200/- |
| شعر العجم اول | 300/- | مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃 | 150/- |
| شعر العجم دوم | 150/- | مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃 | 90/- |
| شعر العجم سوم | 125/- | مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃 | 100/- |
| شعر العجم چہارم | 200/- | مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃 | 110/- |
| شعر العجم پنجم | 150/- | خطبات شبلی مرتبہ: عبد السلام ندوی | 80/- |
| الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی | 350/- | انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی | 45/- |
| (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | | مکاتیب شبلی اول 〃 | 150/- |
| الکلام | 250/- | مکاتیب شبلی دوم 〃 | 190/- |
| علم الکلام | 200/- | اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات) | 250/- |

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
April 2019 Vol - 203 (4)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP-43/019
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

# مطبوعات شبلی صدی

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۔ | سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن) | علامہ شبلی نعمانی | 2000/- |
| ۲۔ | شبلی کی آپ بیتی | ڈاکٹر خالد ندیم | 325/- |
| ۳۔ | دارالمصنّفین کے سو سال | کلیم صفات اصلاحی | 350/- |
| ۴۔ | شذرات شبلی (الندوہ کے شذرات) | مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 220/- |
| ۵۔ | محمد شبلی لائف اینڈ کنٹری بیوشنس | ڈاکٹر جاوید علی خاں | 230/- |
| ۶۔ | حیات شبلی | علامہ سید سلیمان ندوی | 650/- |
| ۷۔ | مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں | اشتیاق احمد ظلی | 250/- |
| ۸۔ | حیات سعدی | تصنیف: خواجہ الطاف حسین حالی | 400/- |
| ۹۔ | شبلی شناسی کے اولین نقوش | مرتبہ: ظفر احمد صدیقی | 600/- |
| ۱۰۔ | شبلی ایک دبستان | آفتاب احمد صدیقی | 250/- |
| ۱۱۔ | متاع رفتگاں | شاہ معین الدین احمد ندوی | 200/- |
| ۱۲۔ | یہود اور قرآن مجید | مولانا ضیاء الدین اصلاحی | 150/- |
| ۱۳۔ | رسائل شبلی | علامہ شبلی نعمانی | 300/- |
| ۱۴۔ | اردو ترجمہ مکاتیب شبلی | ڈاکٹر خالد ندیم | 110/- |
| ۱۵۔ | تاریخ بدء الاسلام (علامہ شبلی نعمانی) | مرتبہ: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی | 300/- |
| ۱۶۔ | مراسلات شبلی | ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی | 150/- |
| ۱۷۔ | مطالعات شبلی | مرتبہ: اشتیاق احمد ظلی | 550/- |
| ۱۸۔ | الفاروق (ہندی) | علامہ شبلی نعمانی | 450/- |
| ۱۹۔ | الندوہ (جلد ۱۔۹) | | 4735/- |